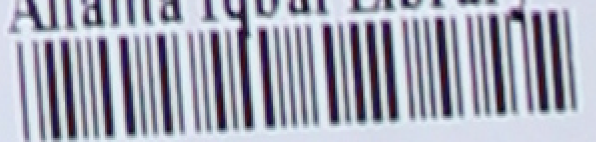
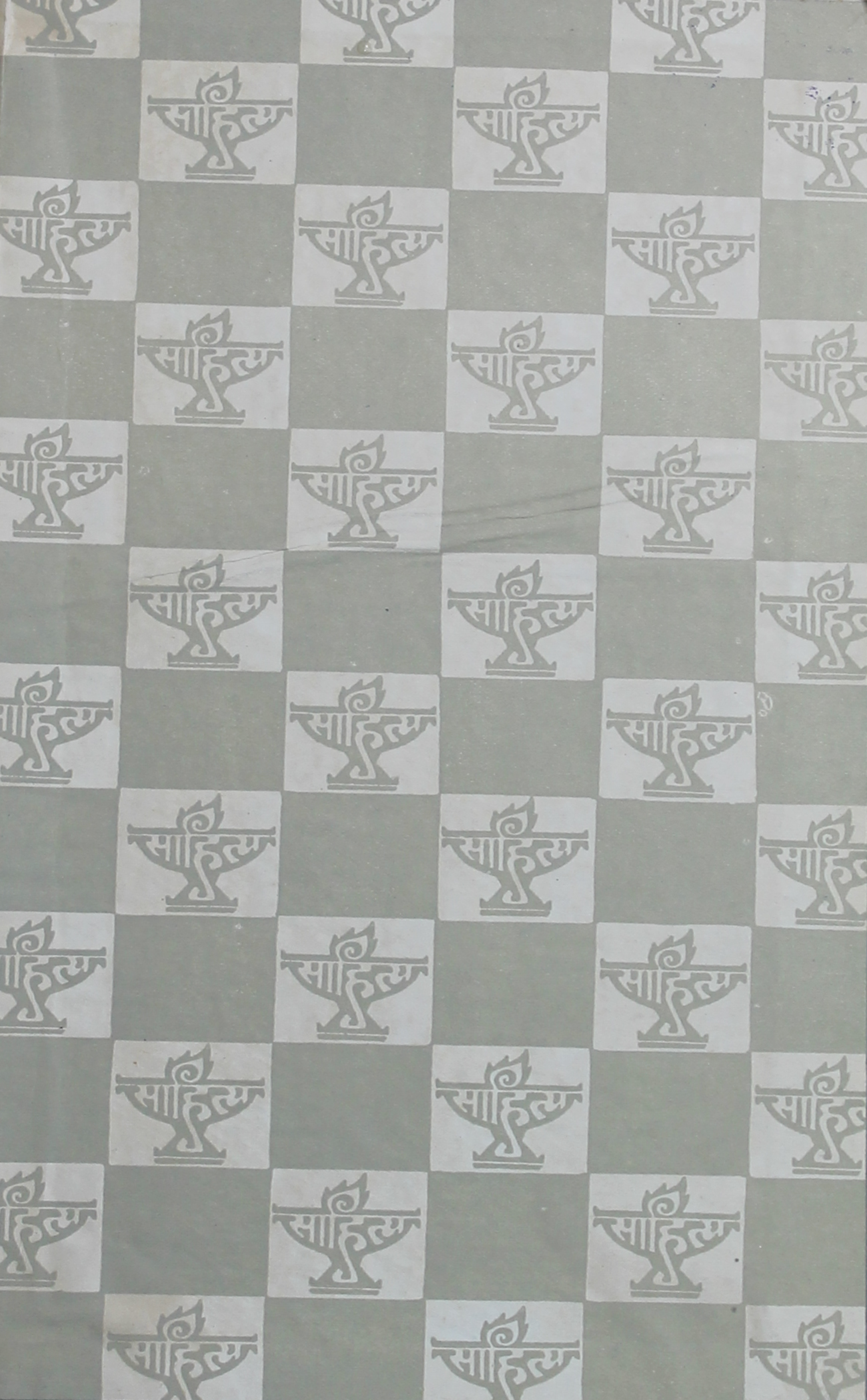
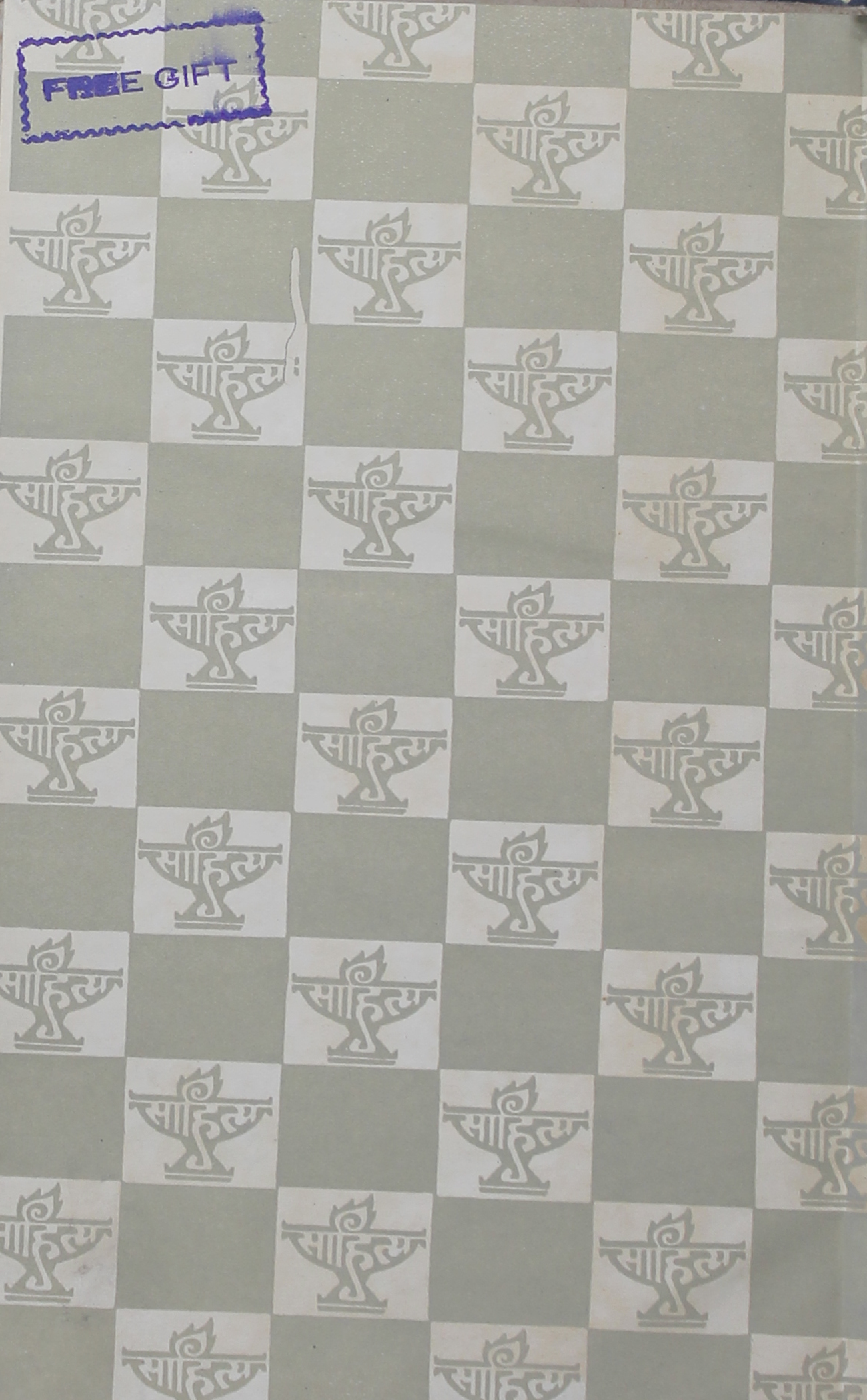
اُردو شاعری کا اِنتخاب








साहित्य


साहित्य

اُردو شاعری کا انتخاب

اردو شاعری کا انتخاب

مرتبہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

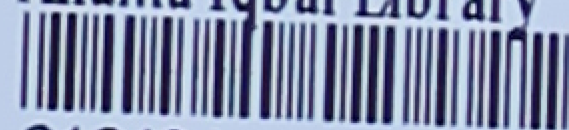


ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی

Urdu Shairi Ka Intakhab (An Anthology of Urdu Poetry)
Edited by Dr. S. M. Q. Zore.
Published by Sahitya Akademi, New Delhi (1960.)
Price Rs. 7/50

ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی
کے لئے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
نے شائع کی





بار اوّل
دسمبر ۱۹۶۰ء

قیمت :۔ سات روپے پچاس نئے پیسے

یونین پرنٹنگ پریس، دہلی

فہرست

دیباچہ

ساہتیہ اکادیمی کے اردو مشاورتی بورڈ کی فرمائش پر اردو شعرا کے کلام کا یہ انتخاب مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں اردو کے بہترین اور اپنے اپنے دور اور مکتبِ خیال کے نمائندہ (۱۵۰) شعرا کا منتخب کلام شریک ہے۔ ۱۴۵۰ء سے آج تک کے پانچ سو سالہ طویل دور میں اردو زبان میں ہزاروں چھوٹے بڑے شاعر پیدا ہوئے اور چونکہ یہ کسی ایک ہی لسانی یا سیاسی علاقۂ ہند کے رہنے والے نہیں بلکہ فضائے ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے تین سو صفحات کی ایک مختصر سی جلد میں ان کا احاطہ کرنا آسان نہ تھا۔ پہلے ان کی

ایک فہرست تیار کی گئی اور اردو کے مشاورتی بورڈ کے ارکان اور دیگر اہلِ ذوق صاحبان کے یہاں بغرض مشورہ ارسال کی گئی۔ اس طرح متعدّد اصحاب کی رائیں حاصل کرنے کے بعد ہر شاعر کے رُتبے اور خصوصیات کے لحاظ سے کم زیادہ کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اس کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اردو کا شاعر خواہ کسی علاقے اور حلقے کا رہنے والا کیوں نہ ہو اور خواہ کسی مذہب یا مسلک کو مانتا ہو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ایک مشترکہ ہندستانی کلچر ہے جو پنجاب سے بنگال تک اور کشمیر سے کرالا تک کے اردو بولنے اور لکھنے والوں پر چڑھا ہوا ہے۔ خواہ ان کی مادری زبان کشمیری ہو یا پنجابی، بنگالی ہو یا بہاری، مرہٹی ہو یا گجراتی۔ چنانچہ اس انتخاب میں ہندوستان کے ہر علاقے کے رہنے والے اور جدا جدا مذہب و مسلک پر چلنے والے شاعروں کا کلام نظر سے گزرے گا۔

مرزا غالبؔ نے کہا تھا کہ "شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے" تعجّب نہ ہوگا اگر اس انتخاب سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہو اس لئے کہ اردو شاعری کا خزانہ اتنا وسیع اور گوناگوں ہے کہ اس میں سے ہر قسم اور ہر نقطۂ خیال کے وافر نمونے فراہم کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس انتخاب میں زیادہ تر ہر شاعر کی اہم خصوصیات واضح کرنے والی غزلیں اور بلند پایہ

نظمیں شریک کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساہتیہ اکادیمی
ہر ہندستانی زبان کی شاعری کے ایسے ہی انتخابات شایع کرنا چاہتی ہے۔

اس انتخاب کے کام میں سب سے زیادہ دشواری ہمعصر شاعروں
کے حالات اور کلام کی فراہمی میں پیش آئی۔ بعضوں نے خطوط کے
جواب ہی نہیں دئے۔ بعضوں نے اپنی تاریخ پیدائش اور ضروری
معلومات وکلام بھیجنے کا وعدہ کیا مگر اب تک اسے پورا نہیں کیا۔
مرتّب نے اپنے مطالعے اور معلومات کی حد تک ان کی بھی کسی نہ کسی طرح
تکمیل کردی ہے۔ چونکہ شعرا کی ترتیب ان کی تاریخ پیدائش کے
لحاظ سے کی گئی ہے اس لئے معاصر شعرا کو بار بار اس طرف توجّہ
دلانا اور ان کے جواب کا انتظار کرنا پڑا۔ شعرائے ماضی کی تاریخوں
کے تعیّن میں بھی بڑی چھان بین اور احتیاط کرنی پڑی۔ ہمارے پرانے
تذکرے تاریخوں اور سنوں کے اندراج کی طرف کم توجّہ کرتے تھے
اس لئے اس سلسلے میں بطور خاص تلاش کی گئی اور جو تاریخیں زیادہ
قرینِ قیاس نظر آئیں انھی کو درج کیا گیا۔ اس بارے میں
جناب غلام ربّانی صاحب تاباںؔ نے بھی میری بڑی مدد کی جس کا
اعتراف ضروری ہے۔

ہر شاعر کے کلام سے پہلے جو مختصر اور ضروری معلومات درج ہیں

وہ ممکن ہے مکمل نہ ہوں مگر احتیاط کی گئی ہے کہ غلط نہ ہوں۔

یہ طے پایا تھا کہ ابوالکلام آزاد مرحوم اس مجموعے کا پیش لفظ تحریر فرمائیں گے اور انتظار تھا کہ کچھ فارم چھپ جائیں تو مولانا کی خدمتِ اقدس میں پیش کر کے ان کا پیش لفظ لکھوایا جائے جس کا انھوں نے وعدہ فرمایا تھا مگر مختلف شاعروں کے کلام کا کاپی رائٹ حاصل کرنے میں اتنی تعویق ہو گئی کہ کتابت کرائی ہوئی کاپیاں پریس کو نہ جا سکیں۔ متعدد اصحاب کے ورثے کا پتہ چلانا ان پبلشروں سے مراسلت کرنا جن کے نام کاپی رائٹ محفوظ تھے بڑا کٹھن مرحلہ ثابت ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس ہفت خوان کے طے کرنے میں پوری طرح کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس مجموعے کے آخر میں ایسے شاعروں کی فہرست درج کی گئی ہے جن کا کلام منتخب کیا گیا تھا اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی مگر قانونی دشواری کے باعث اس کو حذف کر دینا پڑا۔

چونکہ اس تعویق کے باعث یہ مجموعہ مولانا کے پیش لفظ سے محروم ہو گیا ہے اس لئے اس کی ترتیب کے سلسلے میں مولانا نے جو تحریر ارسال فرمائی تھی اس کو بطور تبرک یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"میں نے یہ فہرست دیکھی

(۱) قدما کا کلام اس لئے رکھنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے

کہ اردو شاعری کی ابتدا دکن میں کس طرح ہوئی اور اس کا

قدیم ترین سرمایہ کیا ہے۔ ورنہ جہاں تک مطالعہ اور

دلچسپی کا تعلق ہے یہ مواد بہت کم لوگوں کو متوجہ کر سکے گا۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں اس کی مقدار کم کر دینی چاہیئے۔

ولی سے پیشتر کے صرف چند شعرا کا نمونہ دیدینا اس کے لئے

کافی ہوگا کہ تبدّل و ارتقاء کے اہم نکات نمایاں ہو جائیں۔

میں نے سُرخ پنسل سے چند نام کاٹ دیئے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر نام نکال دیا جائے۔

مقصود یہ ہے کہ کم کیا جائے۔

(۲) مناسب ہوگا اگر ہندو شعرا کی ایک اچھی تعداد شامل کی جائے۔

تذکروں کو دیکھ کر نام بڑھائے جا سکتے ہیں۔

آزاد ۷ — ۳ "
۵۶

جو فہرست اس کے ساتھ منسلک ہے اس میں سے مولانا نے

۱۶ نام کاٹ دیئے تھے۔ ان میں قدیم اور جدید دونوں شعرا شامل ہیں۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ بعض ایسے قدیم و جدید شاعر

اس انتخاب میں شریک نہ ہو سکے جن کے کلام کی شمولیت ضروری

تھی۔ ان میں بعض نے اجازت نہیں دی۔ بعض کے نام مشاورتی

اجلاس میں کم کردئے گئے اور متعدّد کاپی رائٹ کی قانونی پیچیدگی کے
باعث حذف ہوگئے۔ مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ میں نے پانچ سال قبل
جو مجموعہ مرتّب کیا تھا وہ مجروح حالت ہی میں سہی بالآخر شایع ہوگیا۔
ساہتیہ اکادیمی ہندستان کے مختلف زبانوں کی شاعری کے
جو انتخابات شایع کر رہی ہے ان میں اردو شاعری کے انتخاب کی
کمی عرصے سے بری طرح محسوس ہو رہی تھی وہ اس کی اشاعت کے
بعد دُور ہو جائے گی۔

سیّد محی الدّین قادری زورؔ

شیخ اشرف

۱۴۵۰ - ۱۵۱۵ء

شیخ اشرف الدین جالنہ کے رہنے والے تھے اور شیخ ضیاالدین ہمشیرزادہ سیّد علی سانگڑے سُلطان قندھاری کے جانشین تھے۔ انھوں نے ۱۵۰۳ء میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شہادتوں سے متعلق ایک طویل اردو مثنوی لکھی جو اٹھارہ سو ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام نوسرہار ہے۔ اس سے قبل کی مختلف نظمیں اور غزلیں ملتی ہیں لیکن یہ اُردو کی پہلی مثنوی ہے جو بطورِ مکمّل کتاب کے لکھی گئی ہے۔

سبب تالیف نوسرہار

اب سُن میرے یار عزیز	عُمر ہماری گئی ناچیز
آیا جیوں کے بھُوئیں پر بھار	دھندے بھیتر گرفتار
پس کیا نفا کہہ تجھ تھیں	ناؤں نشانی کچھ نہ کنیں
آوے وقت اُٹھ چلنا ہوے	موے ناؤں نہ لیوے کوے
گر یہ اشرف کچھ شعری	اچھے تیری یادگیری
شاید لکھے پڑھے کوئے	تجکوں بارے ثواب ہوئے
ہجرت نبی نو سو نو	کہیا اشرف نوسریو
جو لگ جیوے توں ات جگ	موے پڑھیں قیامت لگ

لھورے بُرے سب سدا — کرتیں اچھیں تجھ دُعا
تجکوں مانگیں آمرزش — حضرتِ حق کی کرنالش
بازاں ہیں بھی اندر خویش — دیکھیا خو ہیں چکھ اندیش
اے سچہ کہتیں اشرف تجھ — مرنا حق ہے اتنا بوجھ
کوئی نہ رہیا ات جگ آئے — سبھ اُٹھ چلین پیٹھ پھرائے
دُنیا تو خود گزراں ہے — ایسی گزری کتنے صد سے
کون کون پیدا گیتی شاہ — آخر سوتے کروٹ گھاہ
اس دُنیا کے رے مکروکید — کیسے کیسے شاہ نپید
آدمؑ حوّاؑ نوحؑ نبی — یوسفؑ اسمٰعیل ذبیح
مہتر داؤدؑ لقمانؑ شیثؑ — یعقوبؑ ابراہیمؑ ادریسؑ
موسٰیؑ عیسٰیؑ رُوح اللہ — احمدؐ مرسل عبداللہ
وو کہہ سُلیمانؑ پیغمبر — دیو پری جس فرماں بر
کیسے کیسے اُٹھے واہ — چاند عروساں مانک شاہ
دارا قیصر شہریاراں — ایسے ایسے جہاں داراں
ڈوبے ایتے جیو رے بس — تجھ کت جیونا اس رہس
کیسے کیسے مرمر گئے — ایسے تجھ سے کیتے سے
نظم آکھی جب موزوں آن — یوں ہیں ہندوی کر آسان
ناماں کیتا بول سنوار — جانو موتیاں کیرا ہار
سونے کی جیوں کھونٹی گھڑ — مانک موتی ہیرے جڑ

کن کن دو کھوں گھڑ را کھے — اب توں کانوں ہین سکے
ایک ایک بول یہ بانک بول — سیم ترازو سیں تھیں تول
بند پروے سوے تار — سچیں ہوا نو سرہار

۲۔ شیخ خوب محمد چشتی

(۱۵۷۸)

احمد آباد گجرات کے رہنے والے اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مُرید و خلیفہ تھے۔ اپنے مرشد کے ملفوظات ۱۵۷۸ء میں خوب ترنگ نام کی مثنوی میں نظم کئے اور پھر اس اردو مثنوی کی شرح ۱۵۹۱ء میں فارسی نثر میں لکھی اور اس کا نام امواجِ خوبی رکھا۔ اس کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں بھی موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ حفظ مراتب (۱۶۰۰ء)، شراب جام، شرح جام جہاں نما۔ وغیرہ خوب ترنگ میں جو قصے لکھے ہیں ان کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

بحری

فتح ہوئی مانڈو کی جب — حاکم شاہ بہادر تب
سیر گاہ مانڈو کے مانہ — بحری ایک اُڑ لائے تانہ
چڑھ جا کے جاگی اکاس — اونچیا چڑھ دیکھیا چہ پاس
چانپانیر مہیں جس ٹھانہ — سیر گاہ تھی دایم جانہ
مانگ جناور سب تس ٹھار — لے آ بیٹھا میر شکار

تامے کی بیلاں تھی تب
تاماں کھاتے تھے تنہ سب

سدا سو تاماں کھاتی جانہ
آخر بجری اُتری تانہ

اونچے چڑھ دیکھے جب کوئے
سب ٹھنہ اُسے برابر ہوئے

دو[2] مصوّروں کا مقابلہ

چین مہیں چتیارے جان
چتریں موڑ سو اُڑتے آن

تنہ کتیک چتیارے اور
دعوا کیا سو آتس ٹھور

کہیا بادشہ کن چل جائیں
لِک پانی پر نقش دکھائیں

گئے سلطان کنیں سب چل
اس سلطاں نیں دیا محل

دونہ ٹولوں چل کیا سلام
ہور یہ کیتا عرض تمام

حکم بادشہ کا جو پائیں
چتر سال کچھ کر دکھلائیں

ہوا بادشہ کا فرمان
دینا دونہ ٹولوں کو امان

کہیا کہ جا کر کرو اتال
آ تمہیں سا تمہیں دو ے دوال

دھوں ٹولے چتریں دونہ ٹھانہ
دھوں[2] پردے باندھیں بچ پانہ

جب لک کام ادھورا ہوئے
تب لک اُن کن جائے نکوئے

حکم سو یہ کیتا سلطان
سبھوں چڑھایا سر فرمان

جیوں فرمایا ستی اصول
پردے باندھ ہوئے مشغول

سہ دیسی چتیاروں آئے
چین مہیں یوں رنگ ملائے

رنگ آمیز کیا اس بھیک
رنگ بھرا کیے سیب سو دیکھ

گگن بھرے دھر یہ من گھانت — ہر رُت رنگ سیکھے بھانت

سبھی زماناں سیکھیا رنگ — نوے نوے دکھلائے ڈھنگ

ایسی بھانتیں رنگ ملائے — پری رنگوں منہ چتر دکھائے

چترے بیچ چہکتے چین — ہوئے اجالا جس تھیں عین

بہت صفائی رنگوں مانہہ — جیو کی صورت چترے تانہہ

چترے کون سویوں بن چین — صفا عکس درپن سوں کین

سب بھانتوں رنگ ریلیا ریت — بادشہ چترا اون کیت

صورت اس اس بھانت لکھائیں — جہاں وہم کے پاؤں بندھاین

تنہ جے پردیسی تھے آئے — رنگ تھنوں ہاں کچھو نپائے

اون ساروں مل کیا بچار — کہو اپن کیا کریں اونہار

یہ ساروں مل پر تھے بات — اپن کریں یوں دن اور رات

کھوٹ جھلکتی کریں دوال — جیوں آرسی ہوئے اجیال

جیوں پرتھیا تیوں کیتا ان — باج صفا کچھ کیا نہ تن

دیس وعدے کا تھا جب — محل دیا سلطاں نیں تب

بولا چتیارے آئیں تانہہ — دور کئے پردے یک ٹھانہہ

سب حیرت منہ ہوئے سو دیکھ — دونہ پاسوں چتریا ایک بھیکیہ

جے ایدھر سو ادھر پائیں — ایک بہ بکیہ سو من نہ لیائیں

سب درگاہ کیا انصاف — چتریا پردیسیوں ات صاف

۳۔ محمد قلی قطب شاہ

(۱۵۸۰-۱۶۱۱)

ابراہیم قطب شاہ کے فرزند تھے۔ گولکنڈے میں پیدا ہوئے اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی ہیں معانی اور قطب تخلص تھا۔ ضخیم اُردو کلیات شایع ہو چکا ہے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی پچاس ہزار شعر لکھے قصیدے، غزلیں، مرثیے، رباعیاں اور مثنویاں جملہ اصنافِ سخن میں کلام موجود ہے۔ برسات بسنت۔ اپنے شہر کے باغوں اور محلات اور محبوبوں پر تفصیلی نظمیں لکھیں۔

بسنت

شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لیایا بسنت
نین پتلی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت

سبز سارے نور تن کسوت کئے ہیں رنگ رنگ
سرو کی مینا میں بھی شبنم کی مے بایا بسنت

سارے پھولاں کی بسنت کا پھول مہمانی کیا
گل پیالہ بن کے خدمت کے لئے آیا بسنت

جوت مانک سے بسنت کے گل کھلے عالم منے
اپنے پھولوں سے فلک پر لال رنگ چھایا بسنت

مہر کے رنگ میں بسنت کا رنگ جھلکتا نور سا
اور چندر کے حوض میں چندن سی مہکایا بسنت
موتی اور یاقوت کے گھر گھر میں انباراں لگے
ہر گدا کو مثلِ خاقاں کر کے دکھلایا بسنت
شکرِ ایزد کر معانیؔ رات دن آنند سے
تیرے مندر میں خوشی آنند سے آیا بسنت

غزلیں

مئے لعلی سے رُخ زردی ہماری دُور کر ساقی
مجالس زہرہ رقاصی سے تو پُر نور کر ساقی
لطافت بیش ہے دن دن سو اُس سروِ سہی قد سے
پیالہ آس کا میرا سو بھر بھرپور کر ساقی
جو کوئی عشق میں ثابت ہے جینا ہے سدا اس کا
سو اُس کے نام سے میخانہ سب معمور کر ساقی
بہشتی باغ میں میری مُراداں کے کھلے ہیں گُل
مری مجلس کو مستِ نغمۂ طنبور کر ساقی
نظر کی مرحمت سے دیکھ مجھ مسکین کو یک پل
پیا کی کیمیائی نگہہ سے فغفور کر ساقی

معانی شوق کے آنسو ڈھلیں رُخ پر کہ جوں موتی
کہ یک پل جیو مجھ ہنس کو نظر منظور کر ساقی

۲

پیا تجھ آشنا ہوں میں تو بے گانہ نہ کر مجھ کو
ٹلے نہ اِک گھڑی تجھ یاد بن تو نا بسر مجھ کو

جہاں تو واں ہوں میں پیارے مجھے کیا کام ہے کس سے
نہ بُت خانے کی پرواہ ہے نہ مسجد کی خبر مجھ کو

بہشت و دوزخ و اعراف کچھ نیں ہے مرے آگے
جدھر تو واں مری جنّت جدھر نیں واں سقر مجھ کو

تری اُلفت کا میں سرمست ہوں تو واں ہوں پیارے
نہیں ہوتا بجز اس کے کسی مے کا اثر مجھ کو

نبی صدقے قطب شہ کو نہیں آدھار کی حاجت
کہ دونوں جگ منے آدھار ہے خیر البشر مجھ کو

پریم کی کہانی

سُنو لوگو میری پرم کی کہانی
کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

تمن عشق بھید یا ہے منج بالے بالا
کہ ہوئی ہوں تمن پیم میں دیوانی

محبّت کی لذّت فرشتیاں کوں نیں ہے
بہت سعی سوں میں سو لذّت پچھانی

جو کوئی عمر کھویا ہے ساجن ہوس ہیں — جیوں پھل وہی پائیا کر میں جانی
اسی کا ہے دو جگ میں جیونا انند سوں — اجنے نیہہ بوجھیا ہے سن لے ایانی
نبی صدقے قطبا جگت مول پایا — سو او عشق ہے اس تھے نیں خوش کہانی

جلوے کا گیت

پریم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے — اسے چند سور سے پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھول مستک کھلے ہیں — سہیلیاں آرتی تارے نوارے
رچاؤ تخت جلوہ کا خوشی سے — کہ چوندھر چوک موتیوں سے سنوارے
چڑاؤ تیل اب ساتوں سُہاگاں — مشاطہ ہو کے زہرہ ہت نگارے
پلا شربت دیوو ہاتھاں میں بیڑے — بندھاؤ ساڑیاں موتیاں کنارے

محمدؐ قطب شہ اور اُس پری کوں
خدایا رکھ جداں لگ ہیں ستارے

۴ - مُلّا وجہی

وجیہہ الدین وجہی گولکنڈے میں پیدا ہوئے۔ عہد محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعرا تھے۔ ۱۶۰۹ء میں بادشاہ کے عشق کی داستان مثنوی قطب مشتری میں لکھی جو چھپ چکی ہے اپنے عہد کے اعلےٰ پایہ اُستاد سخن اور نثر نگار تھے۔ ان کا نثری قصہ سب رس بھی چھپ چکا ہے جو اُردو نثر کی پہلی مبسوط کتاب ہے۔

مجلسِ عیش و طرب

شہنشہ مجالس کیئے ایک رات
وزیراں کے فرزند تھے سب سنگات

ہر اک خوب صورت ہر اک خوش لقا
سو ہر ایک دلکش ہر اک دل رُبا

مہابت کے کاماں میں جم جم ہی جیوں
شجاعت کے کاماں میں رستم ہی جیوں

ندیم ہور مطرب سُگھڑ فہمدار
اتھے شہ سوں مل کر یو سب ایک ٹھار

صُراحی پیالے لے ہاتاں منے
ندیماں تھے مشغول باتاں منے

لگے مطرباں گانے یوں ساز سوں
کہ دھرتی ہلے مست آواز سوں

جو مطرب و صحرا میں اس دھات گائے
تو پھراں کوں اس شوق منے حال آئے

جو گاون و شہ کوں کہماتے اتھے
سو راگاں پہ راگاں جماتے اتھے

ندیماں لطافت میں جو چکہ آئین
تو روتیاں کو خوش کر گھڑی میں ہنسائیں

شراب ہور صراحی نقل ہور جام
ہوے مست مجلس کے لوگاں تمام

جو ہوی رات آدھی پنچھی دو پہر
خبردار یاراں ہوئے بے خبر

بسر گئے ندیماں طرز بات کا
گنوائے خبر مطرباں ذات کا

نہ ہلتے نہ خوبی جھگڑتے کہیں
یکس کے اُپر ایک پڑتے کہیں

لگے مست ہو سٹنے مستی سنگات
یکس کے سو پاواں اُپر ایک ہات

سو یوں پچ وہ یاراں ہوئے بے خبر
کہ پانی پتے تھے شراب ہے مگر

یکس کوں بلا ایک ازماؤں سوں
گلے لگتے تھے مست ہو چھانوں سوں

بجاؤ جو کیں تو اٹھیں گائے کر
سٹے مطرباں ہوش خوشی پائے کر

صراحی پیالے سوں ہم دست ہو
گراں پھرتے تھے وہ دونو مست ہو

یتا مست ساقی ہوا سُد گنوائے
کہ پیالا منگے تو صراحی کوں لیائے

غزلیں

پیوا اپنے کوں ٹک آج میں نس سپنے دیکھی سوے کر
جب پیو چلیا سٹ سیج منج تب سوتے اُٹھی روے کر

ہاتھ بڑھا اپنا سارنے منج چل چل لاگیا مارنے
ناجاؤں سائیں کارنے بھی اجنوں کیا کیا ہوے کر

ناپوچھوں بہمن جوسے کب ملنا پیو سوں ہوسے
غم برہا سب مین سوسے ناجانے دکھ یو کوے کر

کیوں ٹالوں برہا جھال سکی نیں سکتی ہوں سنبھال سکی
اب کیوں کر پاؤں لال سکی جو بیٹھی ہت تے کھوے کر

یک تائیں سہیلی مرنا دل دوجے پرنا دھرنا
اُس پیو کوں اپنا کرنا اس پاپی جیو کوں کھوے کر

۲

طاقت نہیں دُوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا
تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا

کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں
تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

ہر دم توں یاد آتا منجے اب عیش نہیں بھاتا منجے
برہا یوں سنتاتا منجے تج باج تل تل رے پیا

منج تیں تپش جانے تُہیں منج ٹھار جیو لانے تُہیں
منج دل مندھر میانے تُہیں کیتا ہے منزل رے پیا

تو جیو میرا ایں سو دل تج سات رہنا کیوں نہ مل
دن رات میں یک تل نیں تج تے غافل رے پیا

۵۔ مُلّا غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

غواصی گولکنڈے میں پیدا ہوئے، وجہی کے ہم عصر تھے لیکن عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں عروج پایا۔ ۱۶۶۴ء میں مثنوی سیف الملوک اور ۱۶۴۸ء میں مثنوی طوطی نامہ لکھی جو چھپ چکی ہیں اور غزلوں کا کلیات بھی موجود ہے۔ وجہی کے بعد حیدر آباد کے سب سے بڑے شاعر اور ملک الشعرا تھے قصیدے، غزلیں اور مثنویاں اعلیٰ پائے کی لکھی ہیں۔

کُشت و خون

ہوئے جمع جنگی ہزاراں تمام
قوی ہور خونخوار امیراں تمام

یک یک جان یک کوہ یا برج جیوں
لے ہاتاں میں فتنے بھرے گرز جیوں

غضبناک ہو جیوں لنگے دل ہوئے
کلیجے پہاڑاں کے پھوٹ جل ہوئے

سلح پوشں پولاد کے کوٹ جیوں — پر آشوب سمدور کی لوٹ جیوں
اوتالے ہو آفت بھرے عزم سوں — کھڑے آکے میدان میں رزم سوں
بھیا باؤ جیوں قہر کا شور سات — شطت کی اگن سلگ اٹھی زور سات
کیئے قصد لڑنے کوں وو دھیر تھے — زمانا ہوا تل اوپر سیر تھے
اُٹھیا غل جدھر کا اُدھر مار مار — قیامت زمیں پر ہوا آشکار
جھلک دیکھ بجلیاں سی تروار کی — اوڑی فاختی سخت سینسار کی
سٹے دھرت پریوں مُنڈیاں کاٹ کاٹ — سو کس کوں سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ
جو دریا لہو کا اُبلنے لگیا — گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا
سراں تیر اس لہو کے سمدور تھے — جو دستے تھے جیوں بڑبڑے دُور تھے
دھڑاں سب نپٹ موج کی لوٹ مار — تھے ڈبتے نکلتے نہنگاں کے سار
بلایاں کی باناں کوں جیوں آگ لائے — زمیں ہور زمانے کوں وِنتا گ لائے
غضب پر غضب کا جو مارا ہوا — سو ایسا بڑا کچ دھولارا ہوا
دُنیا غیب ہوی اس دھولارے تلیں — گنواں تا گیا دیس اندھارے تلیں
لیا گرد جا ڈھانپ اسمان کوں — دھنواں سانپ ہو نگلیا بھان کوں
بڑا رن پڑیا سخت رگڑا ہوا — کہیں نیں سُنا سو یو جھگڑا ہوا

۶۔ نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور

۱۶۰۰ — ۱۶۸۳

محمد نصرت نصرتی بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ عہد علی عادل شاہ ثانی کے

ملک الشعرا تھے کئی نظمیں لکھیں جن میں گلشن عشق ۱۶۵۷ء اور علی نامہ ۱۶۶۶ء بہت مشہور ہیں۔ اور چھپ چکی ہیں۔ دیوان غزلیات اور دوسری مثنویاں بھی لکھیں۔ ان کے حالات اور خصوصیات کلام کتاب نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور از مولوی عبدالحق میں شایع ہو چکے ہیں۔

دہلی کی فوج

کتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات — چلی تھی دکن دل پہ کس دھات سات
کہ جس فوج کوں دیکھنے میں سمج — دسے نا کسے انتہا ہور اوبچ
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل — نھنا جس میں سردار اصحاب فیل
سراسر اگر بھار سارا دسے — تو یک فوجدار اس میں دارا دسے
سبک منصبی ہور بھاری کتے — اتھے کئی صدی ہور ہزاری کتے
یک یک ملک کے نام آور جواں — دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں
مغولاں کتے ملک و کئی شہر کے — کتے ہندو کئی ماورالنہر کے
چغتی قزلباش ازبک بلی — قندھاری کتے بلخی و کابلی
مروّت کے مفلس محبّت کے شوم — فراست کوں طوطی نحوست میں بوم
فریب ان کے فن میں بڑا بردہے — جنم جن کا ابلیس شاگرد ہے
نچھے جن میں اصلا مروّت کی بوئے — کریں اس سوں بد جس تے نیک ان پہ ہوئے
بدی باپ سوں اپنی میراث جان — برادر کا خوں شیر مادر پچھان
دیکھیں کچ ہے جہاں فائدہ آپ کوں — نچھوڑے سگے بھائی ہور باپ کوں

نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور

اتھے میرزا میر کشمیر کے — غرایب سپاہی بی چوندھیر کے
خراسانیاں اصفہانی کتے — دماوندی و دامغانی کتے
کمنداز کوی گرز بازی میں چست — تیر انداز کوئی نیزہ بازاں درست
بھوکے ہو کے جھگڑے کوں بھڑتے دلیر — لوہے چابنے دل نہوئیں ان کے سیر
خلال ان کے دانتاں کا بھالا دسے — گراں گرز مکہ کا نوالا دسے
کتک ذات کے تھے روہیلے ادٹ — زبردست پنجابیاں دل کے گھٹ
مغل ہر ہنر میں بڑا کارساز — لڑائی کے فن پر توات حیلہ باز

(علی نامہ)

۷۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ

(سلطنت) ۱۶۲۴-۱۶۷۲

سلطان محمد قطب شاہ کے فرزند اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نواسے تھے حیدر آباد میں پیدا ہوئے شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا لیکن اپنے نانا کے ہم پلّہ شاعر نہ ہو سکے۔ قصیدے، غزلیں، رباعیاں اور مرثیے ہر صنف سخن میں کلام موجود ہے۔ ابراہیم عادل شاہ نورس کی طرح موسیقی میں بھی ایک اُردو نظم لکھی تھی۔ دیوان چھپ چکا ہے۔

غزلیں

ہے کیوں مرا دِل آج تو لے اے نگار ہات — کرتا ہوں تج دعا میں اُچا بار بار ہات
تیرے جمال سات نہ پنجا بلا سکے — دھرتا ہے آفتاب اگرچہ ہزار ہات

روشن چراغ دیکھ ترے خاص گال کا
ہر رات چاند لیوے مکہ او پر اُتار ہات

میہندی توں لائی ہی سو منجے محض یوں دسے
جیوں عاشقاں کے لہوسوں کیئے ہیں نگار ہات

نکلے توں سیر کرنے چمن میں تو خم ہو سرو
دوڑا ئے تیرے پانوپہ بے اختیار ہات

صدقے نبی کے شکر کرے شاہ عبداللہ
تجھ سا چڑیا ہے دیکھ در شاہوار ہات

۲

کاں ہے وہ قدرت جو دیکھے تج کدھن گھور آفتاب
گرچہ اپنے حسن میں ہے آج مغرور آفتاب

روپ تجھ اپر روپ دے پیدا کیا ہے گر خدا
پاڑیا جانو خبر تو جا رہیا دور آفتاب

خیر تو ہے جو ادھر میٹھے اُدھر مونیں تو آج
دیکھ تیرا نور ہوتا سرمہ جیوں طور آفتاب

گرم تیرے حسن کا بازار ایسا ہے جو آج
اس اگے دستا ہے منج جیون سرد کافور آفتاب

شاہ عبداللہ نبی کے صدقے تیرے عشق میں
یوں ہوا مشہور جگ میں جیوں ہے مشہور آفتاب

۳

عشق میں جاناں کے ثابت اچہ توں اے جان غم نہ کھا
عہد و پیماں رکھ درست اپنا یہاں ہاں غم نہ کھا

دردمنداں کا سو درماں عین اس کا لطف ہے
ہووے گا یک بارگی مشکل سب آساں غم نہ کھا

رات اندھاری ہے کہ ہرگز تو پشیمانی نہ کھینچ
دِن بھی آوے گا نکل روشن ہو تاباں غم نہ کھا

یو دُنیا[2] دو دن کی ہے مہان اسے پکچ ٹھیر نین
دل نہ باند اس سات توں خوش حال رہ یاں غم نہ کھا

بولتا ہوں کھول میں یو فال کنتری باندلے
ہے تجھے جمعیت آخر اے پریشاں غم نہ کھا

عبداللہ صدقے نبی کے راج کر توں ذوق سوں
ہے ترے سر پر قوی بارا اماماں غم نہ کھا

۴

گلشن ہے توں پیاری بُلبُل ہے دِل ہمارا
رنگ باس دونوں تجھ میں پھل ہو پھلیا نظارا

توں سرو ناز بر تج بن کا چمن سو گھر تج
پھل پھانکہ جیون ادھر تج عاشق سو باو دبارا

تج دیکھ چاند گلتا جھل تھے سورج بھی جلتا
لاجوں تھے نین نکلتا اسمان پر ستارا

چنچل چنچل چنچل تھے خوباں میں خوب ازل تھے
تس لگ شکر کے جھل تھے سمدور ہوا ہے کھارا

صدقے نبی کے آرے عبداللہ شہ پیارے
چند سور تجھ پہ وارے اسپند ہوا ستارا

۸۔ علی عادل شاہ شاہیؔ

(سلطنت ۱۶۵۶-۱۶۷۲)

سُلطان محمد عادل شاہ کے فرزند بیجاپور میں پیدا ہوئے شعر وشاعری سے خاص دل چسپی لی۔ شاہیؔ تخلص اختیار کیا۔ ملک الشعرا نصرتی انہی کے دست گرفتہ اور شاگرد تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز ہے مکمل دیوان موجود ہے۔ جس میں غزلیں اور ترکیب بند اور مرثیے ملے جلے ہیں۔

ترکیب بند

کوئی جاؤ کہو مُج ساجن سات میں نیہ بندی توں کیتا گھات

دِل میرا اپنے سات کیا
مُج برہے میں دن رات کیا
دِل داری کی نا بات کیا
سب بِسرا ٹسک ہیہات کیا
کی مُج سوں ایسی دھات کیا

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات میں نیہ بندی توں کیتا گھات

پیو مورت دیکھوں سپنے میں

جب جاگوں تب رہوں تپنے ییں

لا دیپک برہا اپنے ییں

تن جالے جھک جپنے ییں

آرام اچھے مج کھپنے ییں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات میں نیہ بندی توں کیتا گھات

مج نینو نیندا ں آتی نہیں

یو رین کٹھن سرجاتی نہیں

پیو باج مج کوئی ساتی نہیں

اس بات بن کچ بھاتی نہیں

بن آنسو کے کچ کھاتی نہیں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات میں نیہ بندی توں کیتا گھات

کیا پیو ہمن سے دند کیا

سکھ سارا مج پر بند کیا

میں اُس کی تھی وو چھند کیا

اپ دھیان لگا مج پھند کیا

مج دیہہ جلا اسپند کیا

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات میں نیہ بندی توں کیتا گھات

تج یاد کر تل ملتی ہوں

ہو تیل منے دل تلتی ہوں

تن موم بتی ہو جلتی ہوں
اس جلنے سوں ناٹلتی ہوں
سب رین برہ میں کلتی ہوں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات
جو برہا جالیا تن کوں اب
یو روگ گھنیرا گھیریا تب
جیوں ہنو نت جالیا لنکا سب
اب کیسیں سو سوں میرے رب
میں مکھڑا دیکھوں پیو کا کب
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات
کوئی اور سنو رے میرا حال
پیو کیتا مج سوں جو کو تال
میں جگ تے نت اٹھ آنجو ڈھال
کلپینے آنسو موتی حال
مج یک یک پل ہے اک اک سال
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات
سب سک کے ہیں او دہان ستی
اس ویدھن سوں گن کیان ستی
میں تن ابھرن ان پان ستی

سب سو تن میں من مان مستی
ہور چک انجن مک پان ستی
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

سن سہیلی یو دک بھاری ہے
پیو سات بجوہا ماری ہے
یو پیو برہ کی نیاری ہے
رک سات لاگے یاری ہے
پیو باج جگ اندھیاری ہے
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

جب دو تن سنگ لگ پیو چلے
میں سانسوں گھٹ سلگائی تلے
تن مجمر ہو دل عود جلے
تب سینے بھو مج آئے چھلے
پیو ملنے بن نا ہوئیں بھلے
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

غزل

اول تے دل لگا مج سوں اِنا تو کی پھراتے ہیں
ہمارے سُک بھرے جیو کوں تمے کی دک میں بھاتے ہیں

سر بجن کے چندر سے مک کوں دیکھن کوں ہیا تانے
پرت کرا ور سوں پیارے ہمن کوں کی تپاتے ہیں

ہماری چوک نیں کچ ہور تمیں چپ چپ رکھائی کر
نہیں سوریت کی ریتوں نیپٹ ہمنا کھجاتے ہیں

یکس کوں سیج میں رک کر سمند میں ڈال دو جیوں کوں
اپس کے ہات سوں لے کر ڈوباتے ہور تراتے ہیں

دو تن کے بول سن سن کر ابولے کی ہوئے مج سوں
امولے بول بولو کچ نہ کچ کی کرڑ کرڑاتے ہیں

گئے ہیں سیج میں اکثر دو تن کے ہاتھ کے نکریوں
تمارے گال پر چھب سوں چندر سورج دپاتے ہیں

بھرو پر گانٹھ بھا پیو نے پھرائے ٹک دسے مج یوں
اول تے مار کر تیراں کماں اب تو چھپاتے ہیں

دساویں رات کے شیوے تمارے گات پر سارے
ٹھکانے کون اتا ہمنا سو ان کی جھوٹ کھاتے ہیں

رنگیلے رنگ بھرے شاہی لگائے پیم کا لاوک
جگا تو رین ساری مج نین رنگ میں رنگاتے ہیں

۹۔ طبعی

تصنیف ۔ ۱۶۷۰ء

حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد شاہ راجو کے مرید تھے۔ اور بادشاہ کے خواجہ تاشس قطب شاہی دور کے آخری بڑے شاعر ہیں۔ سنہ ۱۶۷۰ء میں ایک مثنوی بہرام وگل اندام لکھی جس میں ۱۳۴۰ ابیات ہیں۔ زبان میں سلاست ہے۔ اور کلام میں قوت۔

سوال و جواب

بہرام کا سوال

ہوا مجنوں برہ تے سُدھ گنوا ییں — اتھا دانا سو دیوانا ہوا ییں
تجھے دل میں چھپایا ہوں اپس کے — خرابے میں لگایا ہوں دیوا ییں
اُچایا ہوں ترے غم کے پہاڑاں — عجب ہے نیں سینہ پھٹ کر موا ییں
صنم تیرے بدل ہو کر برہمن — گلے میں اپنے بھایا جانوا ییں
منجے کیا دیکھتی ازما گل اندام — پرانا ہوں نہیں عاشق نوا ییں

گُل اندام کا جواب

تجے حاصل نہیں ہے مجھ تے بن غم — نکو کر غم میں اپنا پانو محکم
ترا دل ہو گیا پھوڑا دکھوں تے — نہیں اس زخم کا منج پاس مرہم

طبعی

مرے پانوں پو سر تیرا نہ انپڑے
کرے کھن کی نمن گر تو مگر غم

کدھاں لک غم توں کھانگا بول ہارے
منجے توں چھوڑ دے اچ بھوت خرم

نہ پاگا اس چمن میں تے توں میوہ
ہوا کوتہ سخن واللہ اعلم

۱۰۔ ابوالحسن تاناشاہ

(سلطنت، ۱۶۷۴-۱۶۸۹)

سدی پیٹ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ سلطان قلی قطب شاہ بانی سلطنت گولکنڈہ کے برادر عم زاد سیف خاں عین الملک کی اولاد اور عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ شاہ راجو کے مرید و معتقد تھے انہی کی دعا اور تائید سے بادشاہ کی دامادی اور سلطنت حاصل کی۔ صوفی منش، قلندر مزاج اور نازک طبع تھے۔ شاعروں اور عالموں کے قدر دان اور خود بھی شاعر تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر سے بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور آٹھ مہینے تک تمام ہندستان کی فوجیں گولکنڈہ کے ساتھ سرگرم پیکار رہیں۔ آخر کار شکست کھائی اور قلعہ دولت آباد میں قید کیے گئے وہیں وفات پائی۔

تجھ مکھ کوں کوئی چندر کہتے کوئی سورتیں انور کہتے
کوئی حسن کا بندر کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

تجھ لب کوں کوئی شکر کہتے کوئی شہد سوں برتر کہتے
کوئی خضر جاں پرور کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

کوئی جیو کی پیاری کہتے کوئی سوں اچھن ناری کہتے
ناریاں میں کوئی ناری کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے
تجھ چک کوں کوئی کنجن کہتے کوئی ساحرِ پُرفن کہتے
کوئی حقۂ انجن کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے
جوبن کوں تجھ کوئی گج کہتے یا دو سینیاں سج کہتے
یا مد بھرے پنکج کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

غزل

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ | جیوں گل شگفتہ ہو کو مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لبِ تصویر بے سخن | اے شوخِ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ
چاہتا ہوں وصفِ قد میں کروں فکر شعر کی | اے معنئ بلند شتابی سوں من میں آ
اے جانِ بوالحسن توں اچھے خوش لٹک ستے | بند قبا کوں کھول کے صحنِ چمن میں آ

۱۱- ولی اورنگ آبادی

(۱۶۶۷ — ۱۷۴۱)

ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ تعلیم اور سیاحت کے سلسلے میں احمد آباد، برہان پور، سورت اور دلی کا سفر کیا۔ دلی کئی بار گئے اور زیادہ تر حصۂ زندگی وطن سے باہر گزارا۔ دلی کے فارسی گو شاعروں نے ولی کا کلام سُننے اور ان کا دیوان دیکھنے کے بعد اردو میں شاعری شروع کی۔

زیادہ تر غزلیں اور چند قصیدے لکھے۔ دیوان کئی بار چھپ چکا ہے۔

غزلیں

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
جا کشورِ ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا

تعریف ترے قد کی الف وار سری جن
جا سروِ گلستاں ہیں خوش الحاں سوں کہوں گا

زخمی کیا ہے دل تری پیکاں کی انی نے
یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہوں گا

مجھ پر نہ کرو ظلم تم اے لیلئ خوباں
مجنوں ہوں ترا غم میں بیاباں سوں کہوں گا

دیکھا ہیں تجھے خواب میں لے مایۂ خوبی
اس خواب کو جا یوسف کنعاں سوں کہوں گا

جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن
یہ سوز ترا مشعلِ سوزاں سوں کہوں گا

یک نقطہ ترے صفحۂ رُخ پر نہیں بے جا
اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا

قربان پری رُخ پہ ہوئی چوب سی جل کر
یہ بات عجائب ہے تاباں سوں کہوں گا

بے صبر نہ ہو اے ولیؔ اس درد سوں ہرگز
چلتا ہوں ترا درد میں درماں سوں کہوں گا

۲

مت غصّے کے شعلوں سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مجھ دِل کے کبوتر کو پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اِس کو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری اس بت کو پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے آنکھوں کو لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولیؔ دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

۱۲- شاہ مبارک آبرو

(۱۶۹۲ ۱۷۴۷)

شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد اور سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے۔ آگرے میں پیدا ہوئے اور گوالیار میں تعلیم و تربیت پائی۔ کچھ دن نارنول میں رہے پھر دلّی میں سکونت اختیار کرلی۔ دیوان ۱۸۵۷ء میں ضایع ہوگیا۔ مثنوی آرائش معشوق بہت مشہور ہوئی۔ میرزا مظہر جان جاناں اور دوسروں سے معاصرانہ چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ ان کا کلام تذکروں میں محفوظ ہے۔ اردو کی اصلاح اور اردو شاعری کو شمال ہند میں مقبول بنانے میں بڑا حصّہ لیا۔

غزلیں

نین سے نین جب ملائے گیا
دل کے اندر مرے سمائے گیا

نگہہ گرم سے مرے دل میں
خوش نین آگ سی لگائے گیا

تیرے جانے کی سن خبر عاشق
یہی کہتا موا کہ ہائے گیا

آبرو ہجر بیچ مرتا تھا
مکھ دکھا کر اسے جلائے گیا

۲

کیوں کر نہ ہووے کلک ہمارا گہر فشاں
کرتے ہیں آبرو جو تخلص سخن میں ہم

دلدار کی گلی میں مکرر گئے ہیں ہم
ہو آئے ہیں ابھی تو پھر آکر گئے ہیں ہم

بے رحم و بے وفا تنک رنج و تند خو
تجھ کو ہزار نام سجن دھر گئے ہیں ہم

۱۳- شاہ ظہورالدین حاتم

۱۶۹۹-۱۷۹۲

دلّی میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ شیخ فتح الدین سپاہی پیشہ کے فرزند تھے۔ عمدۃ الملک امیر خاں کے داروغۂ باورچی خانہ تھے مگر قلندر مزاجی کے باعث استعفا دے دیا اور بادل علی شاہ کے تکیے میں فروکش ہو گئے۔ تمام عمر شاعری اور قلندری میں گزاری، کئی دیوان مرتب کئے اور آخر عمر میں ان کا انتخاب دیوان زادہ کے عنوان سے کیا جو محفوظ ہے۔ قصیدے، قطعات، غزلیں اور مثنویاں ہر صنفِ سخن میں کلام موجود ہے۔ دِلّی کے مشہور اُستاد سخن ہیں۔ حالاتِ زندگی "سرگزشتِ حاتم" میں شایع ہوئے ہیں۔

زمانہ کی نیرنگی

کیا بیاں کیجیے نیرنگی اوضاعِ جہاں
کہ بیک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں

جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں
پھرتے ہیں جوتی کو محتاج پڑے سرگرداں

نعمتیں جن کو میسّر تھیں ہمیشہ ہر وقت
روز پھرتے ہیں یہاں قوت کو اپنی حیراں

جن کی پوشاک سے معمور تھے توشک خانے
سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عُریاں

پرچۂ نان کو رکھ ہاتھ میں کھاتے ہیں امیر
جس کو دیکھوں ہوں سو ہی فکر میں غلطاں پیچاں

خوانِ الوان کہاں اور وہ کہاں دسترخواں
یعنی چہ میر چہ مرزا و چہ نواب و چہ خاں

پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا اِس وقت
ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروّت کا نشاں

اقتدار ہے گا جنھیں سو ہیں علیہ اللعنتہ
ہیں گے ہر ایک نخود شمر و یزید و مرواں

گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے
ہمیں مظلوم کے رونے سے نہ آوے طوفاں

کان دھر بات کسو کی نہیں سنتا کوئی
آنکھ سے آنکھ ملانا تو یہاں کیا امکاں

وے جو بے کار ہیں اُن کا تو خدا حافظ ہی
وے جو ہیں نام کو نوکر انھیں تنخواہ کہاں

کیا زمانے کی ہوا ہو گئی سبحان اللہ
زندگی ہو گئی ہر ایک کی اب دشمنِ جاں

زن و بچوں سے چھپا کھاتے ہیں ٹکڑے کے تئیں
غضب آئے جو کوئی جائے کسی کے مہماں

وے جو بھٹڑے کو ترستے تھے سو اس دور میں آج
ہوئے ہیں صاحب مال و محل و فیل و نشاں

رتبہ شیروں کا ہوا ہے گا شغالوں کو نصیب
جائے بلبل ہیں چمن بیچ غزل خواں زاغاں

اے خدا خوب کہا ہے یہ کسو نے مصرع
یعنی نعمت بسگاں بخششی و دولت بہ خراں

مرض ہی بھوک کا عالم کو کرے کون علاج
مگر اس دور کو ہو فضل خدا کا درماں

چشم عبرت سے نظر کیجو اولوا الابصار و
دیکھ لو راست میں کہتا ہوں عیاں را چہ بیاں

حاتم اِس بحر مروت کی علی دیوے داد
جس کا اس وقت ہوا ہے تو عبید الاحساں

۱۴۔ محمد شاکر ناجی

۱۷۵۴

سید محمد شاکر دِلی کے سادات عظام کے خاندان سے تھے۔ وہیں نشو و نما پائی اور نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار میں نعمت خانے کے داروغہ تھے۔ تیز مزاجی اور شوخیٔ طبع کی وجہ سے مشہور تھے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ مگر دیوان محفوظ نہ رہا۔ دِلی کے سماجی حالات پر ایک مخمس لکھا تھا۔ صرف تذکروں

میں منتشر کلام محفوظ ہے۔

غزلیں

دیکھ دلبر تری کمر کی طرف
پھر گیا پانی اپنے گھر کی طرف

جن نے دیکھے ترے لبِ شیریں
نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال ان کا دام میں آنا
دل ہے ان سب بتاں کا زر کی طرف

تیرے رُخسار کی صفائی دیکھ
چشمِ دانا نہیں ہنر کی طرف

حشر میں پاک باز ہے ناجی
بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

۲

معشوق مل کے آپ سے گر دلبری کرے
گر دیو ہو تو چاہیے آدم گری کرے

شیشہ اسی کے آگے بجا ہے کہ رُخ ستی
پیالے کو جب لے ہاتھ میں رشکِ پری کرے

اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو اے جان
شمشاد و سرو آکے تری چاکری کرے

دشمن ہے دیں کا خال سیہ مکھ اوپر ترے
ہندو سے کیا عجب ہے اگر کافری کرے

ناجی جو کوئی صاف کرے دل کا آئینہ
وہ عاشقی کے ملک میں اسکندری کرے

۱۵۔ اشرف علی خاں فغاںؔ

۱۷۷۲ء

مرزا علی خاں کے فرزند اور احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ بذلہ سنجی اور

شگفتہ مزاجی کے باعث بادشاہ نے ظریف الملک کوکہ خاں خطاب دیا تھا۔ ندیم کے شاگرد تھے اور بہت جلد شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔ دِلّی کے حالات سے گھبرا کر مرشد آباد اپنے چچا ایرج خاں کے یہاں چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے لئے اودھ آکر نواب شجاع الدّولہ کے یہاں قدر و منزلت کے ساتھ رہے۔ آخر عمر میں عظیم آباد جا کر راجا شتاب رائے کی سرکار میں اقتدار حاصل کیا اور وہیں وفات پائی۔ دیوان شایع ہو چکا ہے۔

غزلیں

صنم بتا تو خدائی کا مجھ کو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بُت ہوا خدا نہ ہوا

کباب ہو گیا آخر کو پھر بُرا نہ ہوا
عجب یہ دِل ہے جلا بھی تو بے مزا نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچہ کے تئیں پریشانی
بھلا ہوا کبھو کافر تو مجھ سے وا نہ ہوا

۲

مبتلائے عشق کو اے ہمدموں شادی کہاں
آ گئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں

کوہ میں مسکن رہا ہے اور کبھو صحرا کے بیچ
خانۂ اُلفت ہو ویراں ہم کو آبادی کہاں

ایک میں تو قتل سے خوش ہوں ولیکن مجھ سوا
پیش جاوے گی مرے قاتل یہ جلّادی کہاں

کاش آجاوے قیامت اور کہے دیوانِ حشر
وہ فغاں جو ہے گریباں چاک فریادی کہاں

۳

خط دیجیو چُھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

باد صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو | مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا و فور خوش نہیں آتا ہے اشک کا | عالم کو مت ڈبوئیو لے چشم تر کہیں
میری طرف سے خاطرِ صیاد جمع ہے | کیا اُڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے | ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں
رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا | مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے | آنسو کہیں ڈھلک گئے لختِ جگر کہیں
ایذا فغاں کے خو میں یہاں تک روا نہیں | ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

۱۶۔ مرزا مظہر جان جاناں

(۱۶۹۹ - ۱۷۷۷)

مرزا جان کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ بیجاپور سے تعلق رکھتی تھیں۔ کالا باغ مالوے میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے باپ کے نام کی مناسبت سے ان کا نام رکھا۔ اصلی نام شمس الدین تھا جو مشہور نہ ہوا۔ ابتدا سے تصوّف اور خانقاہوں سے دلچسپی تھی۔ نقشبندی سلسلے کے بڑے صوفی مانے جاتے ہیں۔ شعر و سخن اور حُسن پرستی کا بھی بچپن سے چسکا تھا۔ طبیعت میں نفاست اور مزاج میں نزاکت تھی اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت بھی ہے۔ اردو زبان کی اصلاح اور بھونڈے الفاظ کو ترک کرنے اور دِلّی کے محاورے اور روزمرہ کی ترویج میں جدوجہد کی۔ فارسی کا دیوان محفوظ ہے۔ اُردو کلام تذکروں میں ملتا ہے۔ ۸۰ برس کی عمر میں شہادت پائی۔

غزلیں

چلی اب گُل کے ہاتوں سے لُٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بُلبُل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گُل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رُسوا
ڈوبایا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

مراجی جلتا ہے اس بلبلِ بےکس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گُل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دُشمن بھی نہیں دُشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانجاں اپنا

۲

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مُفت جاتی ہے بہار

لالۂ و گُل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

شاخِ گُل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بُلاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سُنتے ہیں آتی ہے بہار

نرگس و گُل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر بھی ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

۳

اس گُل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ساتھ

برگ حنا اوپر لکھو احوالِ دل مرا
شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مِینا لگا ہے جب سے کہ کچھ بینوا کے ہاتھ

مرتا ہوں میرزائیِ گُل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہاتھ چونری تو پنکھا صبا کے ہاتھ

مظہرؔ چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اپنے تو
یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

۴

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجکو وہ دماغ و دل رہا ہے

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اِک شہر میں قاتل رہا ہے

نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام
یہ سر پاؤں سے تیرے ہِل رہا ہے

تجلّی گر تری پست و بلند ان کو نہ دِکھلاتی

فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرض ہو جاتی

حنا تیرے کفِ پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی

یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی

اگر یہ سرد مہری تجکو آسائش نہ سِکھلاتی

تو کیوں کر آفتابِ حُسن کی گرمی میں نیند آتی

الٰہی دردِ غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا

محبّت گر ہماری چشمِ تر سے مینہہ نہ برساتی

۱۷۔ شاہ سراج الدین سرآج

۱۷۶۳

سیّد درویش کے بیٹے اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ اوائل عمر میں جذب و شوق کے عالم میں برہنہ تن جنگلوں میں پھرتے رہے اور شعر کہتے رہے۔ یہ اشعار ایک دیوان کی شکل میں مرتب کر لئے گئے۔ بعد میں اپنے مرشد عبدالرحمٰن کے حکم کی تعمیل میں شاعری ترک کر دی تھی اور صوفی گوشہ نشین بن گئے تھے۔ مثنویاں، غزلیں اور فارسی خطوط و کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے کلام میں سوز و گداز اور درویشی و قلندری نمایاں ہے۔ اس عہد کے بڑے اُستادِ سخن تھے۔

غزل

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خودی کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سُرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دِل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کِس زباں سے بیاں کروں
کہ شرابِ صد قدح آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے عیاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جِلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا راکھ آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراؔج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

مستزاد

ہر صبح فلک پر ملکِ عالمِ بالا   قد دیکھ سجن کا

تسبیح کریں سمٰہ، اللہ تعالےٰ — من کا لیئے منکا

تجھ چہرۂ زرتار کے تاروں کی جھلک دیکھ — آنکھوں کو نہیں تاب

شاید کہ نمودار ہے عالم میں اُجالا — سورج کی کرن کا

پھولا ہے عجائب یہ ہزارا گُلِ لالہ — مجھ دل کے چمن کا

دیدار کی سمرن ہے مجھ آنکھوں کو سرآج آج — پھر کیوں نہ پھرا دیں

پلکوں کی ہر اُنگلی ستی لے ہاتھ میں مالا — آنسو کے رتن کا

۱۸۔ مرزا رفیع سودؔا

۱۷۱۳-۱۷۸۱

مرزا محمد رفیع ولد مرزا محمد شفیع دِلّی میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ سلیمان قلی وداد سے اور بعد کو شاہ ظہور الدین حاتمؔ سے اصلاح لی۔ شاعری کا خداداد ملکہ تھا۔ شاہ عالم نے قدر و منزلت کی لیکن ان کے زوال کے بعد دِلّی سے نکل کھڑے ہوئے اور فرخ آباد اور فیض آباد میں کچھ عرصہ ٹھہر کر آخر کار لکھنؤ میں قیام پذیر ہو گئے۔ نواب آصف الدولہ ان کے بڑے قدر دان تھے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہر صنفِ سخن میں بلند پایہ کلام لکھا۔ ان کی شہرت زیادہ تر قصائد اور طنزیہ و ہجویہ مضامین پر مبنی ہے۔

گھوڑا

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایّام پر سوار — رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے — ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی کے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے مزا جو اُن کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستہ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹپکے ہے بار بار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو کہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبس کہ ہے مجروح بے شمار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب انھوں نے کہ اے مہربانِ من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

مانند میخچوں کے لگد زن ہے تھان پر
لاجنب وہ زمیں سے ہے جوں میخ استوار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنا وے کبھو لوہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹا
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقتِ کار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ سی باگ
ٹک ٹک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبرا اسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبّروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پوَن کے دو اختیار

ناچار الغرض میں ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹا بھی ہوا مجھ سے آ دوچار

گھوڑا تھا بس کہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سی جوں طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصّہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے تم نے جو سُنی
اس پر بھی دل میں آئے تو اب ہو جیے سوار

ہاتھی

بدن پر اب نظر آتی ہے یوں کھال
طناب سُست سے خیمے کا جوں حال

نمودار اس طرح ہر استخواں ہے
گویا ہر پسلی اس کی نردبان ہے

نہ بیڑی ہے نہ کٹ بندھن نہ لکڑا
رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا

ضعیفی نے کی اس کی فربہی گم
گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دُم

ہوئی ہے ناتوانی اس کے درپے
کہ وہ ڈیل اب دھوئیں کی سی گرہ ہے

سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے
کسی مدّت کا یہ بامِ کہن ہے

ستون اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار
رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑوار

جو بیٹھے یہ تو اُٹھنا اس سے ہے دُور
لگیں جب تک نہ اس کو ہاج و مزدور

اٹم ہے خاک کا یا راکھ کا ڈھیر
کہیں ہیں اس کو ہاتھی ہے یہ اندھیر

ہلاتا یوں ہے یہ کانوں کو ہر بار
کہ دھونکیں پنکھوں سے کوُلوں کے انبار

ہے اتنا چلنے میں بجرّیہ بدذات
نہیں ہاتھی صعوبت کی ہے یہ رات

یہ عالم چلنے میں خرطوم کا ہے
کہ دستِ گور میں گویا عصا ہے

جو کہیے فیل اسے بہتان ہے یہ
عجائب تودۂ طوفان ہے یہ

غزلیں

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا

توڑوں گا آئینہ کہ ہم آغوش عکس ہے
ہووے نہ مجھکو پاس جو تیرے حضور کا

بےکس کوئی مرے تو جلے اس پہ دل مرا
گویا ہے یہ چراغ غریباں کے گور کا

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا

۲

گلا کھوں میں اگر تیری بےوفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

زباں ہی شکر میں قاصر شکستہ پائی کے
کہ جن نے دِل سے مٹایا خلش رہائی کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

۳

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کر اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دِل سلّمہٗ اللہ تعالےٰ

اتنا ہے تو یوسف سے مشابہ کہ عدم کے
پردے میں چھپا اس کے تئیں اس کو نکالا

۴

غم میں تسکین دلِ زار کروں یا نہ کروں
نالہ جا کر پسِ دیوار کروں یا نہ کروں

سُن لے اک بات مری تو کہ رمق ہے باقی
پھر سخن تجھ سے ستم گار کروں یا نہ کروں

ناصحا اُٹھ مری بالیں سے کہ دم رُکتا ہے
نالے دل کھول کے دو چار کروں یا نہ کروں

سخت مشکل ہی کہ ہر بات کنایہ سمجھو
ہے زباں میرے بھی گفتار کروں یا نہ کروں

خوابِ شیریں میں وہ اور دل مرا مائل شوق
جی دھڑکتا ہے کہ بیدار کروں یا نہ کروں

حال باطن کا نمایاں ہے مرے ظاہر سے
میں زباں اپنی سے اظہار کروں یا نہ کروں

کوچۂ یار کو میں رشکِ چمن اے سوؔدا
جا کے با دیدۂ خوں بار کروں یا نہ کروں

۱۹۔ خواجہ میر دردؔ

۱۷۱۹-۱۷۸۵

خواجہ ناصر عندلیب کے فرزند، دِلّی میں پیدا ہوئے اور آخر وقت تک وہیں رہے۔ چوں کہ ان کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ چلا آتا تھا اور یہ بھی ۲۸ سال کی عمر میں مسندِ سجّادگی پر بیٹھے تھے اس لئے باوجود پریشانیوں اور

مصیبتوں کے دِلّی سے نہ اُٹھے۔ حالاں کہ اکثر و بیشتر معاصرین اس پریشان حالی کے عالم کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کی قلندری وبے نیازی نے ان کو دِلّی ہی میں جمائے رکھا۔ اور یہی ان کے کلام کی اہم خصوصیت ہے۔ دیوان اردو کے علاوہ کئی کتابیں اور رسالے تصوّف کے مضامین پر لکھے تھے۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا | حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھُلی تھی | کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا | بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا
کھُل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری | جی میں یہ کس کا تصوّر آ گیا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا | برابر ہے دُنیا کو دیکھا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں | کوئی دُوسرا اور ایسا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں | کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا
حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم | کھُلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

جوں نورِ نظر ترا تصوّر | تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم
کِس نے یہ ہمیں بھُلا دیا ہے | معلوم نہیں کِدھر گئے ہم
جس طرح ہوا اِسی طرح سے | پیمانۂ عمر بھر گئے ہم

احوالِ دو عالم ہے مرے دل پہ ہویدا — سمجھا نہیں تا حال کہ اپنے تئیں کیا ہوں

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز — ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

ہوں قافلہ سالارِ طریقِ قدما درد — جوں نقشِ قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

کاش تا شمع نہ ہوتا گزرِ پروانہ — تم نے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ

کیوں اسے آتشِ سوزاں میں لئے جاتی ہے — سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظرِ پروانہ

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی — پوچھوں اے درد میں کس سے خبرِ پروانہ

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے — نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار — اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

اخفائے رازِ عشق نہ ہو آب اشک سے — یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا مجال — دل سے اُٹھا خلاف اگر تو اُٹھا سکے

یہی پیغام درد کا کہنا — گر صبا کوئے یار میں گزرے

کون سی رات آن ملیئے گا — دن بہت انتظار میں گزرے

مدت تئیں باغ و بوستاں کو دیکھا — یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا

جوں آئینہ کب تلک پریشاں نظری
اب مونڈ لیجیے آنکھ بس جہاں کو دیکھا

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی
اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کرے گا اس کو
کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

۲۰۔ شیخ محمد قیام الدین قائمؔ

۱۷۹۵

قصبہ چاند پور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ دردؔ اور سوداؔ سے مشورہ کلام کیا قصیدوں میں سوداؔ کا رنگ اور غزلوں میں درد کا رنگ ہے۔ اردو شعرا کا ایک تذکرہ مخزن نکات بھی لکھا۔ دہلی میں ملازم تھے۔ بعد کو ٹانڈے اور لکھنؤ کا سفر کیا اور آخر کار رام پور چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ اردو کے بلند پایہ شعرا میں شامل ہیں۔

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلف یار بھی پر اس قدر نہیں
ساقی تو شب کی دست درازی معاف کر
ظالم قسم لے مجھ سے مجھے کچھ خبر نہیں
یارب خلش سے آہ کی ہو جو نہ بہرہ مند
جس دل کا تکیہ گاہ سرِ نیشتر نہیں
جوں اشک ایک لغزشِ پا میں گئے ہیں یار
ہستی سے تا بہ نیستی چنداں سفر نہیں
بندہ ہوں بیخودی کا میں اس مست کی جسے
آشوب روز حشر سے اصلا خبر نہیں

ایک جا گہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

اس کمر سے نگہِ شوق لپٹتی تو ہے لیک
جی یہ دھڑکے ہے کہ آجائے نہ الزام کہیں

تم نے کی دل کی طلب ہم نے کہا دینگے ولیک
یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں

ہائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اُٹھا
جن نے دیکھا تجھے اِک بار سرِ بام کہیں

عذرِ تقصیر بھی چاہوں گا میں اس سے اے دِل
ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دُشنام کہیں

عزم کعبے کا تو قائم تو کیا ہے لیکن
رہن مے کیجو نہ واں جامۂ احرام کہیں

گہہ پیرِ شیخ و گاہ مریدِ مغاں رہے
اب تک تو آبرو سے نبھی ہے جہاں رہے

صبر و قرار و ہوش دل و دیں تو واں رہے
اے ہم نشیں یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے

دُنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

اے دیدہ دل کو روتے ہو کیا تم ہمیں تو یاں
یہ جھینکنا پڑا ہے کسی طرح جاں رہے

قسمت تو دیکھ بار بھی اپنا گرا تو واں
جس دشتِ پُرخطر میں کئی کارواں رہے

پیارے ہمیشہ ایک سی رنجش ہی کچھ بھی لطف
ناخوش کبھی ہوئے تو کبھی مہرباں رہے

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائمؔ وہ مے فروش کی اپنی دُکاں رہے

۲۱۔ میر محمدی سوزؔ

۱۷۲۰ تا ۱۷۹۸ء

قراول پور شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ پہلے میرؔ تخلص تھا بعد کو سوزؔ قرار دیا اور سوز ہی ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ دِلّی کی حالت خراب ہوئی تو فقیرانہ لباس اختیار کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں سے مرشد آباد گئے

اور آخر کار پھر لکھنؤ واپس ہو کر وہیں وفات پائی۔

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائے گا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا جائے گا
قتل کی نیّت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
ہاں مگر تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا
پھر بھی کہتا ہوں تجھے آسوز کو یوں مت ستا
مت ستا ظالم کہیں تو بھی ستایا جائے گا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا
یہاں تک کفر پورا چاہیے گر چاک گلشن ہو
بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنّار ہو پیدا
قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں کیا یہ بھی تعجّب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا
مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جُدائی کا
تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا

نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اس کے کبھو اپنا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا

خدایا کس کے ہم بندے کہاویں سخت مشکل ہے
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعوی خدائی کا

خدا کی بندگی کا سوز ہے دعوی تو خلقت کو
ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خود نمائی کا

۲۲۔ میر محمد تقی میرؔ

۱۷۲۴-۱۸۱۰

میر علی متقی کے فرزند، جن کی پہلی بیوی سراج الدین علی خاں آرزو کی بہن تھیں۔ دوسری بیوی میر تقی میرؔ کی والدہ تھیں۔ گیارہ سال کی عمر میں والد کی وفات کے بعد دِلّی چلے گئے۔ کچھ دن اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہے، اور عرصے تک دِلّی میں پریشان حال رہے۔ آخر کار ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ گئے اور عمر بھر دِلّی کو یاد کرتے رہے۔ لکھنؤ میں بھی خاطر خواہ خوش حالی نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ سب ان کو بڑا شاعر سمجھتے تھے لیکن ان کی طبیعت کی خودداری اور نازک مزاجی ان کو سرکاروں اور درباروں سے انعام و اکرام دلانے سے باز رہی۔ ان کے اشعار میں ان کی زندگی کی جملہ خصوصیات جلوہ گر ہیں۔

امّیدوار وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کے کیا خجل — اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف　　اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات　　کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا
جگر ہی میں اک قطرہ خوں ہے سرشک　　پلک تک گیا تو تلاطم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں مونڈ
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کے اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبّت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

دُور بیٹھا غبارِ "میر" اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

قدر رکھتی نہیں متاعِ دِل
سارے عالم میں میں دِکھا لایا

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جاکر
اور بھی خاک میں رلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خُدا لایا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے وہ دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمہیں
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میرؔ
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں   یہ کارگاہ ساری دوکانِ شیشہ گر ہے

اہلِ زمانہ رہتے یک طور پر نہیں ہیں   ہر آن مرتبے سے اپنے انھیں سفر ہے

وے دن گئے کہ آنسو روتے تھے میرؔ اب تو   آنکھوں میں لختِ دل ہے یا پارۂ جگر ہے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے   زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

تمنائے دل کے لیے جان دی   سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

نہ ہو کس طرح فکرِ انجام کار   بھروسا ہے جس پر سو مغرور ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج   گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے

بہت سعی کرنے سے مر رہیے میرؔ   بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی   میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بدگفتنی نہیں میرا   تم نے پوچھا تو مہربانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل   ابتدا پھر وہی کہانی کی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم   سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی   کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے   ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ   سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے
نظر میں سبھوں کے خدا کر چلے

نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

جنوں کا عبث میرے مذکور ہے
جوانی دوانی ہے مشہور ہے

گدا شاہ دونوں ہیں دل باختہ
عجب عشق بازی کا دستور ہے

نیاز اپنا جس مرتبے میں ہے یاں
اسی مرتبے میں وہ مغرور ہے

گیا شاید اس شمع رو کا خیال
کہ اب میرؔ کے مُنہ پہ کچھ نور ہے

سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

کیسا کیسا قفس سے سر مارا
موسمِ گل میں ہم رہا نہ ہوئے

میں نہ گردن کٹائی جب تک میرؔ
عشق کے مجھ سے حق ادا نہ ہوئے

گھر کا حال

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال
اِس خرابی میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم
تنگ تر ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینہ سقف چھلنی تمام　　چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریئے　　راکھ سے کب تلک گڑھے بھریئے

جا نہیں بیٹھنے کو گھر کے بیچ　　ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق　　سو شکستہ تراز دل عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے　　کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا　　شور ہر کونے میں ہے مچھّر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے　　کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں　　پتھّر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے　　جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان　　وہی اس ننگ خلق کا ہے مکان

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ　　اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے　　کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر　　گھر کہاں صاف موت کا ہے گھر

مٹّی تودہ جو ڈالے چھت پر ہم　　تھے جو شہتیر جوں کمان ہیں خم

اینٹ مٹّی کا در کے آگے ڈھیر　　گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار　　تھر تھراوے بھنبیری سی دیوار

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب　　اُڑ بھنبیری کہ ساون آیا اب

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

ایک چھپّر ہے شہرِ دِلّی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے
سو وہ مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب
پا کھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینھ میں کیوں نہ بھیگیے یک سر
پھوس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر

واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
پینچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار میں تنہا
کچھ نہیں آج مجھ سے ہو سکتا

بسکہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

جنسِ اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹّی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلہ یا جو پائینتی کی اور	وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور
تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی	ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
اک ہتھیلی میں ایک گھائی میں	سیکڑوں ایک چارپائی میں
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے	کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے
دو طرف سے ہے کُتوّں کا رستا	کاش جنگل میں جا کے میں رہتا
ہو گھڑی دو گھڑی تو ڈنکاروں	ایک دو کُتّے ہوں تو میں ماروں
چار آتے ہیں چار جاتے ہیں	چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز	کُتوّں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

۲۳۔ انعام اللہ خاں یقین

۱۷۲۷۔۱۷۵۵ء

شیخ اظہر الدین خاں کے فرزند۔ دلّی میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے اور اتنے اعلیٰ پائے کے غزل گو تھے کہ لوگوں نے رشک و حسد کی بنا پر مشہور کر دیا تھا کہ مرزا مظہر نے ان کو دیوان لکھ دیا ہے۔ ان کے دیوان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل میں پانچ ہی شعر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف منتخب کلام ہی کو شریک دیوان کرتے تھے اور اس لیے ان کا سب کلام غزل گوئی کے اعلیٰ معیار پر اُترتا ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔

نہیں معلوم اب کی سال میخانہ پہ کیا گزرا	ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانے پہ کیا گزرا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دَیر کے آگے
خدا جانے تری صورت سے بتخانے پہ کیا گزرا

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزرا

ہوئے ہیں چور میرے استخواں پتھر سے لڑکوں کے
نہ پوچھا یہ کبھی تو نے کہ دیوانے پہ کیا گزرا

یقیںؔ کب یار میرا سوزِ دل کی داد کو پہنچے
کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گزرا

گرا میں آنکھ سے تیرے جہاں کے ہاتھ کیا آیا
مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا

مرے ان آنسوؤں نے کھو دیا نورِ بصر میرا
یہ یوسف بیچ کر اس کارواں کے ہاتھ کیا آیا

دماغِ گل کہ دھوئیں سے خار و خس کے کر دیا ناخوش
جلا کر آشیاں کو باغباں کے ہاتھ کیا آیا

نہ کہتی رازِ دل تو اتنی رُسوائی بھلا سہتی
فضیحت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

یہ بیمار آپ مر جاتا جو جیتا ان کے کام آتا
یقیںؔ کو مار کر زور آوراں کے ہاتھ کیا آیا

بہار آئی ہے ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں دیکھیں

اُٹھا اس مُنہ سے اے بادِ صبا گھونگھٹ کے آنچل کو
توجہ سے تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں

ہر اک نے راہ میں اس کی کیا ہے چشم کو گریاں
کرے کس آبِ جو پر رحم وہ سروِ رواں دیکھیں

پکاریں اُن کو آؤ اپنے باغوں کی خبر پوچھیں
اسی گلشن سے آتی ہیں چلی یہ بلبلاں دیکھیں

یقیںؔ کے سر کو ٹھکرا کر بتاں آپس میں کہتے ہیں
جیئے گا کب تک ان طرحوں سے ایسا ناتواں دیکھیں

بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور
آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

جو کوئی عرضِ حال کرے تجھ ستی مرا
اوّل بیان واقعۂ کربلا کرے

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ہوتا ہے خاک راہ وفا بیگماں یقیںؔ
ہے دل میں یہ کہ شرطِ محبّت ادا کرے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

دوستی بد بلا ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے

ہے وہ مقتول کافرِ نعمت
اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے

رو مرے کو خدا قیامت تک
پشتِ پا سے تری جدا نہ کرے

ناصحوں یہ بھی کچھ نصیحت ہے
کہ یقیںؔ یار سے وفا نہ کرے

نہیں ہے جامِ مے بن کچھ بھی ہمارا خوں بہا ساقی
اس آبِ زندگی سے اپنے ماروں کو جلا ساقی

ٹک اِک تو رحم کر اب مر گئے مے کی تمنّا میں
ہماری خاک پر روتے ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

ارے زاہد نہیں بے دین وایماں اہلِ میخانہ
کہ ہے یاں بادہ وحی و جام پیغمبر خدا ساقی
بہار آئی ہے پر افسوس یہ دِن کیا بھلے کٹتے
جو ہوتا باغباں مخلص ہمارا آشنا ساقی
بُڑھاپے میں یقینؔ کے جامِ مے سے دستگیری کر
شرابِ کُہنہ ہے اس دردِ پیری کی دوا ساقی

زنجیرِ میں بالوں کی پھنس جانے کو کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے
عاشق جو رہے جیتا معشوق کے کام آوے
کیا لطف ہے جل جانا پروانے کو کیا کہیے
دِل چھوڑ گیا ہم کو دِل بر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بے گانے کو کیا کہیے
تحقیق کو ظالم نے ٹک کام نہ فرمایا
فرہاد کے اس ناحق مر جانے کو کیا کہیے
صحرا میں یقینؔ آہو کیا جور سے پھرتے ہیں
فردوس نہ کہیے تو ویرانے کو کیا کہیے

۲۴- میر حسن
۱۷۲۷-۱۷۸۶

میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے۔ دِلّی میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ والد کے ساتھ فیض آباد گئے، اور بعد کو لکھنؤ چلے آئے۔ پہلے ضیاؔ سے اور بعد میں سوداؔ سے کلام میں مشورہ لیا۔ مثنوی سحرالبیان کی وجہ سے جاودانی شہرت پائی۔ یوں تو اور بھی مثنویاں رموز العارفین، گلزارِ ارم، اور خوانِ نعمت وغیرہ بھی لکھیں۔ قصیدے اور غزلیں بھی لکھیں چنانچہ مکمّل دیوان موجود ہے۔ شعرائے اردو کا ایک عمدہ تذکرہ بھی انھوں نے لکھا تھا۔ لیکن ان کی مثنوی سحرالبیان اتنی مقبول اور مشہور ہوئی کہ دوسرے سب کارنامے پیچھے رہ گئے۔

ہجر میں بدرِ منیر کی حالت

گئے اِس پہ دِن جب کئی اور بھی
بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی

دِوانی سی ہر طرف پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

تپِ ہجر گھر دل میں کرنے لگی
دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی

خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی

تپِ غم کی شدّت سے وہ کانپ کانپ
اکیلی لگی رونے مُنہ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے | محبّت میں دن رات گھُٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو | تو اُٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے | تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی | یہ دِن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھایئے | کہا خیر بہتر ہے منگوایئے
جو پانی پلانا تو پینا اسے | غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پینے کا ہوش | بھرا دل میں اس کے محبّت کا جوش
غزل یا رُباعی و یا کوئی فرد | اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں | نہیں کچھ تو اس کی بھی خواہش نہیں
سبب کیا کہ دل سے تعلّق ہے سب | نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل | کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
زباں پر تو باتیں و لے دل اُداس | پراگندہ وحشت سے ہوش و حواس
نہ مُنہ کی خبر اور نہ تن کی خبر | نہ سر کی خبر نہ بدن کی خبر
نہ منظور سُرمہ نہ کاجل سے کام | نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا ہو بھاؤ | کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناؤ

۲۵۔ خواجہ محمد میر اثرؔ

۱۷۹۰

خواجہ محمد ناصر کے فرزند اور خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ دِلّی

میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ درؔد کی طرح صوفی منش اور انہی کے
خلیفہ اور سجّادہ نشیں تھے۔ سادگی اور دلکشی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔
اکثر و بیشتر چھوٹی بحروں میں غزل لکھتے تھے۔ اور یقیؔن کی طرح منتخب
پانچ اشعار ہی ہر غزل میں رکھتے تھے۔ ایک مشہور مثنوی خواب و خیال بھی لکھی تھی۔

تیرے آنے کا احتمال رہا — مرتے مرتے یہ ہی خیال رہا
شمع ساں جلتے بلتے کاٹی عمر — جب تلک سر رہا وبال رہا
دل نہ سنبھلا اگرچہ میں تو اسے — اپنے مقدور بھر سنبھال رہا

کبھو کرتے تھے مہربانی بھی — آہ وہ بھی کوئی زمانہ تھا
تو نہ آیا ادھر کو ورنہ ہمیں — حال اپنا تجھے دکھانا تھا
کیا بتاویں کہ اس چمن کے بیچ — کہیں اپنا بھی آشیانہ تھا

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں — پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھے مجھ سے — بات میری جو معتبر ہی نہیں
تیری امید چھٹ نہیں امید — تیرے در کے سوائے در ہی نہیں

دل رُبائی و دلبری تجھ کو — گو کہ آتی ہے پر نہیں آتی
کیا کہوں آہ میں کسو سے حضور — نیند کس بات پر نہیں آتی
نہیں معلوم دل پہ کیا گزری — اِن دنوں کچھ خبر نہیں آتی

۲۶- لچھمی نارائن شفیقؔ

۱۷۴۵-۱۸۰۰ء

لالہ منسارام کے فرزند تھے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ شعروسخن اور تصنیف وتالیف کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ آخر زمانہ حیدر آباد میں گزارا۔ جہاں عالی جاں فرزند آصف جاہ ثانی ان کے بڑے قدر دان تھے۔ صاحبؔ اور شفیقؔ دونوں تخلّص تھے۔ کئی کتابیں لکھیں۔ چمنستانِ شعرا۔ شامِ غریباں۔ گل رعنا۔ تمنیق شگرف۔ حقیقت ہائے ہندستان۔ ماثر آصفی۔ بسایط الغنایم۔ وغیرہ۔ ان کی مثنوی تصویر جاناں بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ یقینؔ کے رنگ میں لکھتے تھے۔

ان وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت　　ہم چلے تم کو تواب کرکے دعا یا قسمت

ہم ترستے ہی مریں لوٹے مزہ یوں پرویز　　کوہ کن چیر کے سر کو یہ کہا یا قسمت

مہر اور لطف و تسلّی ہے رقیبوں کے نصیب　　ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

آخری دم ہے ٹک اک دیکھ بھلا اے قاتل　　بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

حق تعالےٰ نہ کرے کس کو کسی پر مائل　　میں نے دیکھا ہے گرفتار ہو آزاد کہ بس

بس ڈھکی رہنے دو یہ بات میاں مت بولو　　ہم تمھیں دیکھ لیا اور تمہارا اخلاص

بات کہتے ہی گئی جان تصدّق تم پر　　ہم پہ یہ کچھ ہے نہ یہ کچھ ہے ہمارا اخلاص

مُرے سے وعدہ کر کے پھر مکرنا ترى باتیں بنانے کے تصدق
مرا دل لینے ہی تک آشنا تھا ترے آنکھیں پھرانے کے تصدق

دل اُلجھتا ہے مرا جیوں کہ سُلجھتے ہیں وہ بال
کیا مچے گی دیکھیے کاکُل کے کھُل جانے میں دھوم
کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سینی میخانے میں دھوم

کیا کریں عرضِ حال تیرے پاس ہم کو دل نئیں تجھے دماغ نہیں
کوئی بچارا تجھے کہاں ڈھونڈے ایک جا گا ترے سُراغ نہیں

آبِ حیات حق میں سخن گو کے ہے سخن باقی ہے میرے بعد یہی یادگار کچھ
اس طور تھج گئے ہیں نئیں کس کی یاد میں نرگس کو ہے چمن میں مگر انتظار کچھ

دوستی کر تم سے ہم بیکس ہیں ہے رے دوستی
ہم تمھیں دل دے کے یوں بے بس ہیں ہے رے دوستی
گالیاں بھی کھا چکے جھڑکی بھی تیری سہہ گئے
یہ تمہاری دوستی کے جس ہیں ہے رے دوستی

جب کھلے بندوں گیا اور رسما تو باغ میں
تیری ایسی طرح پر سب گل بھی خنداں ہو گئے
ہر جہت بادِ صبا کے یہ قدم کا فیض ہے
مرقدِ بلبل پہ گل جو یوں چراغاں ہو گئے

۲۷۔ شیخ قلندر بخش جرأت

وفات ۱۸۱۰ء

حافظ امان کے فرزند دلّی میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت حاصل کی۔ جعفر علی حسرت کے شاگرد ہوئے۔ نجوم اور موسیقی میں بھی مہارت پیدا کی۔ ستار خوب بجاتے تھے۔ نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ عین جوانی میں چیچک کی بیماری کے باعث آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ غزلیں، رباعیاں، مخمس، واسوخت اور ہجویں لکھیں۔ فارسی ترکیبوں کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ اور سادگی و سلاست کے باوجود دلکش کلام لکھتے تھے۔

اے دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتا
جا کے ہم روتے ہیں پہروں پسِ دیوار کہ تو

ہاتھ کیوں عشقِ بتاں سے نہ اٹھایا تو نے
کفِ افسوس ہم اب ملتے ہیں ہر بار کہ تو

وہی محفل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکلِ گنہگار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ لب سے نہ لگا ساغرِ عشق
مے اندوہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

بے جگہ جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بُری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچوں ہوں میں آہِ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

غور کیجے تو یہ مشکل ہے زمیں اے جرأت
دیکھیں ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

میر ہونے سے تو کچھ گرمیٔ بازار نہیں
میں ہوں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

دل تو اُمڈے ہی یہ حیرت ہے میں کیونکر روؤں
اب تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں

درد کیا جانیے کیا کیا یہ بیاں کرتا ہے
دہنِ زخم کو گویا لب گفتار نہیں

تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی
جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو اِدھر دیکھو

دیکھنا زلف و رُخ تمھیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

۲۸۔ سیّد انشاءاللہ خاں انشاءؔ

۱۷۵۶-۱۸۱۶ء

حکیم ماشاءاللہ خاں کے بیٹے تھے۔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد نواب بنگالہ کے طبیب تھے۔ فطری شاعر تھے۔ بچپن ہی میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور اپنے والد سے اصلاح لی۔ دلّی آنے کے بعد شاہ عالم

کے درباری شاعر بن گئے۔ پھر لکھنؤ جاکر مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی۔

یہیں مصحفی کا بھی ساتھ ہوا اور شاعرانہ چشمکیں شروع ہوئیں۔ نواب سعادت علی خاں

کے مصاحب بنے اور اپنے تمسخر اور درباد داری سے عروج حاصل کیا۔ جودتِ طبع

اور تنوع پسندی کے باعث ہر طرح کا کلام لکھا۔ اور ہر میدان میں استادی

کی شان دکھائی۔

مجھے رونا آتا ہے شمعِ سحر پر ۔۔۔ کہ بےچاری اب مستعد ہے سفر پر

اجی کیوں رلاتے ہو مجکو تمھیں کیا ۔۔۔ نہیں رحم آتا مری چشمِ تر پر

یہی وضع ہے تو مجھے کھوئیے گا ۔۔۔ پڑے پھریئے گا ہاتھ رکھے کمر پر

اجی جی میں ہے اب کہیں بیٹھ رہیئے ۔۔۔ بس اک باندھ تکیہ کسی رہ گزر پر

جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو ۔۔۔ مطول کو دے مار تو مختصر پر

کچھ اک صاف صاف ایسے لکھ شعر انشاؔ ۔۔۔ کہ وہ ماریں چشمک صفائے گہر پر

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیّار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر

غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہیں ہیں صبر کس کو آہ ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اِک بار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں

نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب اُلٹا

عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اِک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا

یہ شبِ گزشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست پڑھ کے نعرہ
جو زمیں پہ پھینک مارے قدح شراب اُلٹا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

ہوئے وعدے پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اے لو دیکھو کچھ تماشا یہ سُنو عتاب اُلٹا

کھڑے چُپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اُجڑ گئے کو
وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ ہوا ہے خواب اُلٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیوں کر انشاؔ
کہ ہوا نے خود بخود آ ورقِ کتاب اُلٹا

۲۹۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

۱۷۵۰ء۔۱۸۲۴ء

شیخ ولی محمد امروہوی کے فرزند تھے۔ امروہے میں پیدا ہوئے اور عنفوانِ شباب میں دلّی آ گئے۔ اور شعر و سخن کے میدان میں مہارت پیدا کی۔ اپنے یہاں مشاعرے کیا کرتے اور اپنی طبعی فروتنی اور سنجیدگی کے باعث عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد اور لکھنؤ چلے

گئے۔ وہاں انشاؔ سے بڑے تکلیف دہ مقابلے رہے۔ لیکن یہ خاموشی کے ساتھ اپنا حلقۂ اثر اور کلام میں اضافہ کرتے رہے۔ آٹھ دیوان اور شاعروں کے دو تذکرے یادگار چھوڑے۔

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا
یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا

کیا لطف مقام ان کو جو مشتاق عدم ہیں
دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سحری کا

بندہ ہے ترا مصحفیؔ خستہ کو یارب
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

جو ہم سے وعدۂ دیدارِ یار ٹھیرے گا
تو کچھ نہ کچھ یہ دلِ بے قرار ٹھیرے گا

کرے گی تن کو بھی بیتاب بے قراریِ روح
ہوا میں خاک یہ مشتِ غبار ٹھیرے گا

خدنگ خوردہ دل آگے سے اس کے جاتا ہے
بہ جز عدم نہ کہیں یہ شکار ٹھیرے گا

شتاب آیو ٹھیرا رکھیں گے ہم اس کو
جو دم لبوں پہ شبِ انتظار ٹھیرے گا

جو اُٹھ گیا فلک کے ستانے سے اُٹھ گیا
آسودگی کا خوف زمانے سے اُٹھ گیا

گو اب ہزار شکل سے جلوہ گری ہوئی
اپنا تو دل اس آئینہ خانے سے اُٹھ گیا

باقی نہ مصحفیؔ کا رہا خاک بھی نشاں
نقشِ قدم کی طرح زمانے سے اُٹھ گیا

۳۰۔ نظیر اکبر آبادی

۱۷۳۵-۱۸۳۰

محمد فاروق کے بیٹے تھے۔ دِلّی میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں آگرے

چلے گئے۔ متھرا میں معلمی کی ملازمت کی۔ اور پھر آگرے میں عمر بھر یہی خدمت کرتے رہے۔ لکھنؤ اور بھرت پور بلایا گیا مگر آگرے سے جانا پسند نہ کیا۔ فطری شاعر تھے۔ آخر عمر میں صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اپنے شاگردوں کے لئے معمولی معمولی موضوعوں پر دلچسپ نظمیں لکھا کرتے اور یہی نظمیں آج اردو نظم نگاری کے شہ کار سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی نظمیں بہت ہی دل چسپ اور نیچرل شاعری کی علمبردار ہیں۔ کلیات چھپ چکا ہے۔

برسات کا تماشا

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے
جگنو چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے
لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے
گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہاتھوں میں ہیں ہر اک کے پھولوں کی لال چھڑیاں
بجلی چمکتی پھرتی اور لگ رہی ہیں جھڑیاں
گل بوٹوں کے جو اوپر بوندیں ہیں مینھ کی جھڑیاں
برسیں ہیں یا ہزاروں اب موتیوں کی لڑیاں
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

تاج گنج

یارو جو تاج گنج یہاں آشکار ہے
مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے
روضہ جو اس مکان میں دریا کنارہ ہے
ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکان
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے

ایسا ہلال اس میں سنہرا ہے دل پسند — ہر بار جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے

تعریف اس مکان کی میں کیا کیا کروں نظیرؔ — اس کی صفت تو مشتہرِ روزگار ہے

بنجارہ نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

قزّاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقّارا

کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا یا سر بھارا

کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہی ہے لکھّی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے

اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے

کیا شکّر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے

کیا راکھ منقّے سونٹھ مرچ کیا کیسو لونگ سپاری ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھّم جاوے گا

یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا

قزّاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا

دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈنڈا ہے
زر دام و درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن سے نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں گون تری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹّی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصّوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی
کیا برتن سونے چاندی کے کیا ہنڈیا چینی مٹّی کی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑا کا ساتھ لئے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ
کیا چلمن پردے فرش ہے کیا لال پلنگ اور رنگ محل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا. بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے ہیں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ زرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن

کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سے اور ملانکے گا

ہر ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک تن کا آن نہ جھانکے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

۳۱۔ غلام علی راسخ عظیم آبادی

۱۸۲۲—۱۷۴۹

پٹنے میں پیدا ہوئے، اور عرصے تک کلکتہ، غازی پور اور دلی کی سیر و سیاحت کی۔ اور آخر کار پٹنے واپس ہو کر وہیں مقیم ہو گئے۔ میر کے شاگرد تھے۔ کلام پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔ طرزِ بیان سادہ ہے۔ تصوف کا ذوق نمایاں تھا۔ غزلیں، مثنویاں اور قصیدے سب ہی لکھے۔ پٹنے میں اردو شاعری کا دبستان ان کی وجہ سے قائم ہو گیا۔

عالمِ صورت کا چھپ جانا عیاں ہو جائے گا
یہ مرقع اِک دن آنکھوں سے نہاں ہو جائے گا

دردِ دل میرا نہ چشمِ کم سے دیکھ اے رشکِ مہر
یہ ہن ہو گا یہ اگر تو آسماں ہو جائے گا

آہ مجھ سے نالہ کش کی ہو گی مدفن جو زمیں
اس زمیں کا قطعہ سارا نیستاں ہو جائے گا

مت جلا دل کو مرے ہر دم کہ یہ ابرو قرہ
اب جو ہے آبِ ریزہ آتش فشاں ہو جائے گا

بازگشتِ عمرِ رفتہ کا سبب ہے شربِ مے
زاہد اِس کو پی کہ پھر تو بھی جواں ہو جائے گا

مت سُنو غیروں کے واں ہر شب تم افسانے طویل
ورنہ اِک دِن قصّہ ہی کوتاہ یاں ہو جائے گا

پائے گا اس بے نشاں کا کچھ تو لے راسخ نشاں
آپ کو کھو کر جو بے نام و نشاں ہو جائے گا

کِس سے تم ہم کنار تھے صاحب
رات ہم بے قرار تھے صاحب

ہائے وے دن گئے کہ تم میری
شمعِ شبہائے تار تھے صاحب

کچھ تمہیں اختیار ہو گا یاں
ہم تو بے اختیار تھے صاحب

شوق نے آہ کر دیا بے وقر
ورنہ ہم باوقار تھے صاحب

غنچہ کیوں ہو رہے ہو راسخ ہائے　　　تم تو باغ و بہار تھے صاحب

جلتا ہوں داغ تفرقہ رفتگاں ہوں میں
اس کاروانِ رفتہ کا یعنی نشاں ہوں میں

رشتہ ہوا ہے منقدِ سوزن کا تن مرا
یاں تک غمِ قوی کے سبب ناتواں ہوں میں

آ بیٹھے تیر اُس کا کبھو آرزو یہ ہے
آغوش اس لئے ہمہ تن جوں کماں ہوں میں

بازارِ حسن میں کوئی خواہاں نہیں مرا
بکتا ہوں اِک نگاہ پہ تس پر گراں ہوں میں

وابستہ ہے نمودِ سخن میری طبع سے
یعنی یہ آفتاب ہے اور آسماں ہوں میں

کوئی سمجھ سکا نہ جسے اِس جہان میں
اُس جانِ جاں کا محرمِ سرِ نہاں ہوں میں

کیسہ جواہری کا ہے راسخ یہ میری طبع
خامہ مرا کہے ہے کہ گوہر فشاں ہوں میں

سیمیا ساز عشق ایسا ہے　　　جس سے دل دشت دیدہ دریا ہے
کوئی در پردہ کار فرما ہے　　　ڈھب سے اس کارگہ کے پیدا ہے

بے سروپا ہوئے ہم اس کو دیکھ　　وہ سراپا بھی کیا سراپا ہے
کچھ نہ سمجھے گئے کسو سے تم　　بارے اتنا تو ہم نے سمجھا ہے
حسن میں ہے کہاں عدیل اُن کا　　عشق میں کون میرا ہمتا ہے
وے گئے تم نہ مر گئے راسخ　　جیتے ہو اب تک آہ یہ کیا ہے

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے
چشمِ تر کی وسعتِ داماں ہم دکھلادیں جی میں ہے
ابر بہت پھیلاؤ اب اپنے دامن کا دِکھلاتا ہے
سبزہ صفت سر یاں نہ اُٹھا تو دیکھ روشِ یہ خوب نہیں
ہوتا ہے پامال وہ آخر سر جو کوئی اُٹھاتا ہے
عشق ہے کیا زور آور حاکم بندہ اس کے حکم کا ہوں
جِن سے شرف اسلام کو ہے زنّار اُنھیں بندھواتا ہے
ہونٹ ہیں سوکھے تر ہیں آنکھیں زرد ہے چہرہ راسخ آہ
بندے سے صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

۳۲۔ شاہ نصیرالدین نصیر

۱۸۳۸ء-

شاہ غریب کے فرزند۔ دلّی میں پیدا ہوئے۔ شاہ محمدی مائل کے

شاگرد تھے۔ دو بار لکھنؤ کا سفر کیا۔ کئی مرتبہ حیدر آباد بھی گئے اور آخر کار وہیں فوت ہوئے۔ طبیعت میں نفاست اور مزاج میں لطافت تھی۔ دربارداری کے آداب اور خوش پوشاکی میں ماہر تھے۔ مہاراجا چندو لال دیوانِ دکن نے بڑی قدر و منزلت کی۔ مشکل زمینوں میں قادر الکلامی اور اُستادی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اُن کا دیوان شایع ہو چکا ہے۔ ذوقؔ اور مومنؔ جیسے اساتذہ کا اُستاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حیدر آباد میں بھی سیکڑوں شعرا نے استفادہ کیا۔

سو مُردے جِلاوے ہے وہ اِک جنبشِ لب سے — مُنکر کوئی اعجازِ مسیحا سے ہو کیوں کر
حُسنِ رُخِ دل دار ہے ہر جا متجلّی — پنہاں یہ مرے دیدۂ بینا سے ہو کیوں کر
فردا تری فردائے قیامت سے نہیں کم — تسکین مجھے وعدۂ فردا سے ہو کیوں کر

کیوں نہ رکھے دانۂ انگور کی تسبیح شیخ — لے گیا دامن کشاں مسجد سے میخانے کا شوق
حلقۂ چشمِ غزالاں خانۂ زنجیر ہے — کھینچ کرلے جائے ہے صحرا کو دیوانے کا شوق

کر ذبح اسیرانِ قفس کو کہیں صیّاد — پرواز کی طاقت نہیں تا بام کسی کو
انصاف تو کر دل میں ٹک اے ساقیٔ کم ظرف — خالی کوئی دیتا ہے بھلا جام کسی کو

۳۳۔ شیخ امام بخش ناسخ

۱۷۸۷ء۔۱۸۳۸ء

خدا بخش لاہوری کے فرزند۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ورزش جسمانی کا شوق تھا۔ علمی قابلیت معمولی تھی۔ لیکن شروع سے شاعری کا ذوق تھا۔ پہلے نواب محمد تقی خاں اور پھر میر کاظم علی کے یہاں ملازم رہے۔ معتمد الدّولہ نے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرّر کر دیا تھا۔ اب پہلوان کی جگہ شاعر بن چکے تھے۔ لکھنؤ کے متعدّد سیاسی ریشہ دوانیوں میں حصّہ لیا اسی لئے دو بار لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد میں قیام کرنا پڑا۔ زیادہ تر غزلیں لکھیں۔ دو دیوان چھَپ چکے ہیں اور ایک قلمی بھی ہے۔ دِلّی کے مقابلے میں لکھنؤ کا دبستانِ سخن بنانے میں جد و جہد کی اور اُردو زبان کی اصلاح کے لئے یادگار کام کیا۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رُو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

شفق سمجھا ہے اس کو اک عالم وائے بے دردی
فلک پر گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا
نہ اُلجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تہہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشّاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہوں شعر تر پیدا
ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا

وہ نخلِ باغِ جہاں ہیں ہوس میں کہ ہوتی ہے
ہر ایک شاخ پہ ئے دستۂ تبر پیدا

کیا ہے آتشِ غم نے مرا یہ خشک لہو
کہ مثلِ سنگ رگوں میں ہوئے شرر پیدا

شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو بو نہیں آتی
ہو چاک چاک اگر دل تو ہو اثر پیدا

جو ہیں حسین وہ مفلس کبھی نہیں رہتے
گلوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے دیکھو زر پیدا

میں بے خبر ہوں مگر ہے جنونِ عشق نہاں
ہوئے ہیں داغ چھپانے کو موئے سر پیدا

یہ رنگت اس کی سنہری ہو گر نہائے کبھی — نیا رہیے کریں حمّام سے بھی زر پیدا
نہ داغِ یاس سے گھبرا بر آئے گی اُمیّد — گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا
بلائے چشم نہ حسن اور نغمہ آفتِ گوش — کریں وہ چین ہوئے ہیں جو کور و کر پیدا

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشک چیں کا
یہ اس کی ہے ساعدوں کا عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بے دم
نیام تیغِ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا
یہ جوش پر یاں ہے اشک کا یم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم
جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہِ آتشیں کا
بُرا ہو بد بخت عاشقی کا نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشقِ بُتاں میں ٹیکا نشانِ سجدہ مری جبیں کا
طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

۳۴۔ چندو لال شاداں

۱۷۶۱ء-۱۸۴۵ء

چندو لال ولد نانک رام، برہان پور میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد میں نشوونما پائی اور چھوٹے چھوٹے عہدوں سے ترقی کرکے ریاست حیدر آباد

کے وزیر اعظم ہو گئے۔ ان کا دربار بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کا مرکز تھا۔ سیکڑوں اہلِ علم و ہنر کو ماہوار تنخواہوں اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ان کا دیوان اور دوسری تالیفات شایع ہو چکی ہیں۔ راجا ٹوڈرمل کے خاندان سے تھے۔ تواضع اور انکسار اور مغلیہ کلچر کے نمائندہ تھے۔

میٹھی باتیں کر لے اپنے یار سے ۔۔۔ میں تجھے کہتا ہوں سُن لے پیار سے
دُوسرے سے اب تجھے کیا کام ہے ۔۔۔ کام رکھ تو اپنے اِک دِلدار سے
زاہدو آجائے جب ماہِ صیام ۔۔۔ ڈرتے رہیے مست اور سرشار سے
اپنی اُلجھن تجھ سے شاداںؔ کیا کہوں ۔۔۔ دِل ہے اُلجھا طرۂ طرّار سے

ابر چھایا ہے مزے کا ہے سماں ۔۔۔ ہاتھ سے میرے پیاغ پیجیے
جُز تمھارے نہیں مقصد کچھ اور ۔۔۔ تم سے جو مانگتے ہیں سو دیجے

جلوۂ حسن تیرا کیا کہیے ۔۔۔ جس نے دیکھا وہ بس نشانا تھا
ہم تو مشتاقِ دید تھے صاحب ۔۔۔ اپنا مُنہ ہم سے کیوں چُھپانا تھا

روز و شب تجھ کو صورتِ نرگس ۔۔۔ مہر و مہ دیکھنے نکلتے ہیں
مست کرتا ہے اِک نگاہ میں تو ۔۔۔ کب تجھے دیکھ ہم سنبھلتے ہیں

اب شکل دکھا کر حجاب مت کر — سو جاں سے ترے نثار ہیں ہم
جھٹکے بھی تو چھوڑیں گے نہ تجھ کو — دامن کے ترے غبار ہیں ہم

تھے جو نافرماں ہوئے سب داغدار — کیا جمائی تو نے مسّی کی دھڑی
لعل میں آیا نظر نیلم کا رنگ — جب جمائی لب پہ مسّی کی دھڑی

۳۵۔ بہادر شاہ ظفر

۱۷۷۵—۱۸۶۲ء

اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے اور دلّی کے آخری تاجدار۔ یوں تو ہندستان کی سلطنت ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہی ہاتھ سے نکل چکی تھی مگر برائے نام سہی بادشاہ مانے جاتے تھے اور لال قلعہ میں شاہانہ سطوت و حشمت کے ساتھ حکومت کرتے اور شعر وسخن کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ پہلے شاہ نصیرؔ سے اصلاح لی اور بعد کو ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ زبان اور محاورہ اور سلاست وسادگی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ غزلیں، مخمس، مسدّس، مثلث، سلام سب ہی لکھے۔ مستزاد بھی ہیں۔ اکثر طویل بحروں میں لکھا کرتے تھے۔ کلام چھپ چکا ہے۔ ہندستان کی جنگِ آزادی میں میں بڑے رنج اٹھائے اور آخرکار رنگون میں جلاوطن کردیئے گئے تھے۔ اور وہیں بے کسی کی موت پائی۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیئے گرچہ بنایا تھا مجھے کاش خاکِ درِجانانہ بنایا ہوتا
تشنۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
دمِ بسمل اے بتِ عشوہ گر خوشی عید کی سی ہوئی مجھے
خمِ تیغ تیرا جو سامنے نظر آیا مثلِ ہلال تھا
کہو اس تصورِ یار کو کہوں کیوں نہ خضر خجستہ پا
کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا
مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے
وہ جب آ گیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہے بے وفا وہ ہے پُر جفا وہاں لطف کیسا وفا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امرِ محال تھا

پسِ پردہ سُن کے تری صدا ترا شوق دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطرابِ کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھوٹ کے جو جست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

۳۶۔ میر شمس الدین محمد فیضؔ

۱۷۸۰-۱۸۶۶ء

میر شمس الدین محمد ولد میر امیر الدین حیدر آباد میں پیدا ہوئے علم و فضل اور شعر و سخن میں خصوصی مہارت پیدا کی۔ حافظ تاج الدین مشتاقؔ کے شاگرد تھے۔ نواب شمس الامرا امیر کبیر کے مشیر کار اور ان کے خاندان کے اکثر امیروں کے اُستاد اور رہبر تھے۔ انہی کی وجہ سے یہ خاندان عرصے تک حیدر آباد میں علم و فضل کی سرپرستی کرتا رہا۔ متعدد کتابیں لکھیں اُردو کے کئی دیوان شایع کیے۔ حیدر آباد میں اُستاد کل اور جگت گرو سمجھے جاتے تھے۔ حالاتِ زندگی اور منتخب کلام فیضِ سخن میں چھپ چکا ہے۔

رُخ اپنا تم نے دکھلایا تو ہوتا مہِ کامل کو شرمایا تو ہوتا
دہن ہے یا نہیں کیا بات ہے یہ کبھی کچھ تم نے فرمایا تو ہوتا

میر شمس الدین محمد فیضؔ

تماشائٹ کا پھر تم کو نہ بھاتا　　ہمیں زلفوں میں لٹکایا تو ہوتا

میں شہیدِ ناز ہوں مسکن مرا مدفن ہوا　　عاقبت میرا کفن میرا ہی پیراہن ہوا
مرتبہ یاں پست کا بالا پسِ مردن ہوا　　سنگِ پا آخر مرا سنگِ سرِ مدفن ہوا
ہے اسیری آرزوئے خلقتِ دیوانگی　　طوقِ گردن مجھ کو میرا حلقۂ دامن ہوا
افعی کاکل نظر آتے ہیں لہراتے ہوئے　　کیا دلِ ویراں ہمارا کیوڑے کا بن ہوا
ہے دلیل رہنمائی تیرہ بختی بعدِ مرگ　　مشعلِ راہِ فغاں داغِ دلِ روشن ہوا

پری سمجھا کبھی میں حور سمجھا　　تجھے کیا کیا نہ اے مغرور سمجھا
بھٹکتے ہی نہیں نزدیک جو فیضؔ　　بتوں نے کیا خدا کو دور سمجھا

اپنی ہو یا کہ ہو پرائی بات　　نہیں رکھتے جو منہ پر آئی بات
کیا غضب ہے بتوں کی محفل میں　　نہ کریں ہم کرے خدائی بات
تم سے یوسف کو کچھ نہیں نسبت　　دیکھی یہ وہ سنی سنائی بات

کاکل کے گرفتار ہیں زنجیر کے لائق　　ابرو کے گنہ گار ہیں شمشیر کے لائق
صیاد مرے حلق پہ رکھتا ہی چھری کیوں　　ہوں صیدِ زبوں میں نہیں تکبیر کے لائق
رسوائے محبت جو ترے ہیں وہ کسی جا　　تعظیم کے قابل ہیں نہ توقیر کے لائق

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم

محبت ہے تو اپنے سے، عداوت ہے تو اپنے سے
ہیں آپ ہی دوست اپنے ہم، ہیں آپ ہی اپنے دشمن ہم

ہدایت ہم سے ہے پیدا، ضلالت ہم پہ ہے شیدا
کبھی ہیں رہنما اپنے، کبھی ہیں اپنے رہزن ہم

ہوا اے فیضؔ معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

شب ہم کو، نہ تو ہم مجھ کو — جانتا ہیں ہوں تمھیں، تم مجھ کو
زلف والوں نے برنگِ شانہ — کر دیا صرفِ تبسم مجھ کو
نہ ہلوں جب تئیں وہ لب نہ ہلیں — گر مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو

بحرِ امواج ہر حباب میں ہے — عین بے پردگی نقاب میں ہے
ہیں محیط و مجاز دونوں ایک — آب گوہر میں گوہر آب میں ہے
اپنی غفلت ہی عین بیداری — آپ ہی کا خیال خواب میں ہے

دل کو پھر اضطراب ہوتا ہے — دہر میں انقلاب ہوتا ہے
جب وہ مستِ شراب ہوتا ہے — اک زمانہ خراب ہوتا ہے

ایک تیرے نہ ہونے سے مجھ پر سو طرح کا عذاب ہوتا ہے

تذکرے ہو رہے ہیں قامت کے دِن قریب آگئے قیامت کے

بُت کریں دعویٰ انا اللٰہی کھیل ہیں یہ خدا کی قدرت کے

۳۷۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ

۱۷۷۸—۱۸۴۶ء

خواجہ علی بخش کے فرزند. فیض آباد میں پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔ مرزا محمد تقی خاں کے ملازم ہوئے اور انہی کے ساتھ لکھنؤ گئے۔ جہاں مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ خاندان مشایخین سے تعلق کی بنا پر طبیعت میں فقیری اور متانت تھی۔ اسی لیئے نہ تو دربار سے تعلق پیدا کیا اور نہ کسی کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی کی جگہ سادگی اور سلاست کی طرف مائل تھے۔ زبان اور محاورے سے زیادہ مطالب و معانی اور رنگینی و رعنائی پر زور دیتے تھے. مشہور استاد اور ایک خاص دبستانِ سخن کے بانی تھے۔

حُسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اس کا ہُشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

گُل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش بُلبُل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اس کی جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا

وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا

آوارگیٔ نکہتِ گُل ہے یہ اشارا
جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتشؔ
لبریزیٔ مے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

خارِ مطلوب جو ہووے تو گلستاں مانگوں
بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں

خاک میں بھی جو ملوں میں تو کسی صحرا میں
تم سے مٹّی بھی نہ اے گبر و مسلماں مانگوں

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

رنج سے عشق کے ہے راحتِ دُنیا بدتر
زخمِ خنداں ہو اگر میں گُلِ خنداں مانگوں

یاس و حرماں ہوں جو لوہے کے چنے بھی تو چباؤں
نعمتِ عشق کے قابل لب و دنداں مانگوں

مِلتی ہو مانگنے سے باغِ جہاں میں جو مُراد
گُل سے بلبل کے کفن کے لیے داماں مانگوں

جامۂ جسم سے رُکنے کا نہیں دستِ جنوں
پیرہن خاک میں دیوانۂ عریاں مانگوں

بختِ واژوں نے زباں کو یہ اثر بخشا ہے
تلخیٔ مرگ مزہ دے جو نمک داں مانگوں

کب سے در پر ترے سائل ہوں میں آتشؔ کی طرح
وہ ملے مجھ کو جو کچھ اے شہِ خوباں مانگوں

۳۸۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

۱۷۸۹ — ۱۸۵۴ء

شیخ محمد رمضانی کے بیٹے تھے۔ دلّی میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول سے تعلیم پائی۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے، لیکن بعد میں ان سے معرکے رہے۔ بہادر شاہ ظفر ان کے شاگرد ہوئے اور خاقانیٔ ہند خطاب دیا۔ قصیدہ نگاری

ہیں ممتاز تھے اور سودا کے بعد اُردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو مانے جاتے ہیں۔ غالب سے مقابلے رہے اور غزلوں میں وہ ان سے بازی لے گئے۔ ان کے کلام میں زبان اور محاورہ اور لفظی شان و شکوہ بہت نمایاں ہے۔ کلام ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں تلف ہو گیا۔ ان کے شاگرد آزاد نے بہر حال ایک دیوان شایع کر دیا۔

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچّا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا تھا مثلِ قُلقُلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعلِ غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گُہر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہ کَن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ہم سا بھی اب بساط پہ کم ہوگا بدقمار
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بُری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو ہو معلوم وقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبّت والے — بیچیں الماس و نمک سنگِ جراحت والے

گئے جنّت میں اگر سوزِ محبّت والے — تو یہ جانو رہے دوزخ میں یہ جنّت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی یہ عادت والے — صبحِ محشر کو بھی اُٹھیں نہ ترے متوالے

رہے جوں شیشہ و ساعت وہ مکدّر دونوں — کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا لبِ جاں بخش ترے — جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبّت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت — تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے

ہائے رے حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی — لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

نہیں جُز شمع مجاور مری بالینِ مزار — نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ، نہ کرم کی خواہش — دیکھو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ — جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے دل کچھ کہتا — دونوں اک حال میں ہیں رنج و مصیبت والے

تو جو آجائے تو اے دردِ محبّت کی دوا — میرے ہمدرد ہوں بے درد نصیحت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلمِ آتشباز — میری شرحِ تپشِ دل کی کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا — دلِ بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

تو مرے حال سے غافل ہو پر اے غفلت کیش — ترے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہی گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ — اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

۳۹۔ ملک الشعرا مہدی علی خاں ذکیؔ

۱۷۹۳—۱۸۶۶ء

نواب محمد سعید خاں والیِ رام پور اور غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے

دربار میں شہرت حاصل کی۔ نواب ناصر الدولہ کے عہد میں حیدر آباد آئے اور قدر و منزلت پائی۔ یہاں سے لکھنؤ واپس ہوئے۔ واجد علی شاہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ غدر کے بعد خانہ نشین ہو گئے۔ زیادہ تر کلام غدر میں تباہ ہو گیا۔ جو کچھ بچا تھا نولکشور سے ۱۸۶۱ء میں بعنوان کلیاتِ ذکی شایع ہوا۔

بارِ غم منزل نہ پہنچا خاطرِ ناشاد کا
لٹ گیا رستے میں شاید قافلہ فریاد کا

دام کے پھندے قفس کی تیلیاں توڑیں تو کیا
کاش رشتہ ٹوٹ جاتا الفتِ صیّاد کا

کوچ ہے دارِ فنا سے ہستیٔ جاوید کو
کوسِ رحلت شادیانہ ہے مبارک باد کا

عرسِ مجنوں میں ہے اب تک حلقۂ ماتم کی دھوم
خانۂ زنجیر میں ہے غلغلہ فریاد کا

حلقِ بسمل پر وہ چل چل کر ٹھہر جاتا ہے کیا
تھک کے دم لیتا ہے دم اس خنجرِ بیداد کا

گر سوادِ طرّۂ طرزِ سخن سے رنگ اڑائیں
ہاتھ شانے سے قلم ہو مانی و بہزاد کا

دل کے آجانے سے ہے یاں دھوم شادیٔ مرگ کی
مصرعِ واسوخت ہے نغمہ مبارک باد کا

آرزو اصلا نہیں سیرِ پرستاں کی ذکیؔ
آنکھوں میں چھایا ہے عالم ہند حسن آباد کا

اک ذرا تیغِ نگہ کو جو اشارہ ہو جائے
آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہو جائے

جلوہ آرا ہو جو برقِ نگہِ یار کا عکس
آبِ آئینہ عجب کیا ہے جو پارا ہو جائے

ماہتابی سی چھٹی چاند کے رخسارے پر
چاندنی میں جو وہ مہ انجمن آرا ہو جائے

نکہتِ زلف جو لے جائے وہاں موجِ نسیم
خاکِ صحرائے جنوں عنبر سارا ہو جائے

بوسہ ہائے لبِ شیریں کا مزا یاد جو آئے
تلخ کامی دلِ عاشق کو گوارا ہو جائے

حرفِ خامہ سے نکلتے ہی ستارا ہو جائے جلوۂ نورِ معانی کا اثر ہو تو ذکیؔ

مرے دل کا نگاہ سے خوں نہ بہا تجھے اپنی جلوہ گری کی قسم
تجھے نشۂ بے خبری کی قسم، تجھے شوخیِ جان بری کی قسم
تجھے عارضِ رشکِ قمر کی قسم، تجھے شعلۂ داغِ جگر کی قسم
تجھے شوخیِ برقِ نظر کی قسم، تجھے گرمیِ جلوہ گری کی قسم
تجھے دیدۂ شعلہ فشاں کی قسم، تجھے خندۂ زخمِ نہاں کی قسم
تجھے لالۂ سوختہ جاں کی قسم، تجھے داغ کی شعلہ وری کی قسم
تجھے کچھ بھی خیال ہے رشکِ قمر کہ ہوا ترے غم میں یہ خستہ جگر
کوئی دم مری خاک پہ آکے ٹھہر تجھے شمعِ دمِ سحری کی قسم
مرے دیدۂ تر ہیں یہ شعلہ فشاں ترے عکسِ جمال کا ہے یہ نشاں
غمِ عشق سے دل میں داغِ نہاں ترے چہرۂ رشکِ پری کی قسم
نہ کر اتنا ذکیؔ دلِ زار کو خوں کہ یہ فوقِ سخن ہے مذاقِ زبوں
ترے طرز سے آئی ہے بوئے جنوں مجھے تیری بے جگری کی قسم

۴۰۔ وزیر علی صباؔ

—۱۸۵۰ء

میر بندہ علی لکھنوی کے فرزند تھے۔ واجد علی شاہ کے دربار سے تعلّق تھا۔ دو سو روپے ماہوار پاتے تھے۔ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ اور زبان کی

صفائی اور پاکیزگی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کا ایک دیوان غنچۂ آرزو ۱۸۵۰ء میں شایع ہوا تھا۔

اے صبا جذب پہ جس دم دلِ ناشاد آیا ‏ ‏ میرے آغوش میں اُڑ کر وہ پری زاد آیا

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے ‏ ‏ بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

بن گیا خاک جبیں کو کب بختِ خورشید ‏ ‏ کس ترقّی پہ ترا حُسن خدا داد آیا

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنوں زاد میں ‏ ‏ بڑھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی ‏ ‏ لیجئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

عرصۂ حشر میں ہوگا گزری کا عالم ‏ ‏ لے نہ جانا کہیں دُنیا کا بکھیڑا دل میں

چھا گیا لیجئے بڑھ کر چمنِ ہستی پر ‏ ‏ نخلِ اُلفت کا لگایا تھا ذرا سا دل میں

اے صبا جس کے لئے ہوں میں پریشاں خاطر ‏ ‏ جانتا ہے وہ مجھے گیسوؤں والا دل میں

مغتنم ہے باغ عالم کی ہوا دو چار دن ‏ ‏ صورتِ گل ہے یہاں نشو و نما دو چار دن

سبزۂ خط کا نمو ہے چاند سے رُخسار پر ‏ ‏ اور رخ پر چھوڑ تو زلفِ دوتا دو چار دن

او بُتِ کافر تری اللہ رے بے پروائیاں ‏ ‏ آشنا دو چار دن نا آشنا دو چار دن

مُدّعائے وصل سُن کر وہ صنم کہنے لگا ‏ ‏ بیٹھ کر مسجد میں کر یادِ خدا دو چار دن

مجھ گریباں چاک کے مرنے سے اک وحشت رہی ‏ ‏ وا رہے اس شوخ کے بندِ قبا دو چار دن

روز آتی ہے لبِ گورِ غریباں سے صدا ‏ ‏ شادی و غم ہے پئے شاہ و گدا دو چار دن

نکہتِ گل پھر کہاں بادِ بہاری پھر کہاں
باندھ لے اے باغباں اپنی ہوا دو چار دن

دام پیدا کیجئے، مے ہو چکی مفلس ہوئے
بیٹھے ہیں مسجد میں بن کر پارسا دو چار دن

بادۂ گلگوں چلے ہر روز چل کر باغ میں
موسمِ گل کے یہی ہیں اے صبا دو چار دن

۱۴۱۔ سیّد محمد خاں رِندؔ

۱۷۹۷ — ۱۸۵۷ء

سراج الدّولہ غیاث محمد خاں نیشاپوری کے فرزند اور برہان الملک بانیٔ سلطنت اودھ کے اعزہ میں سے تھے۔ فیض آباد میں تولد ہوئے، اور شاہی محل میں تربیت پائی۔ ابتدا میں وفاؔ تخلّص اختیار کیا اور خلیقؔ سے اصلاح لی۔ لکھنؤ آنے کے بعد آتشؔ کے شاگرد ہوئے۔ ان کے کلام میں رِندی اور شوخی نمایاں ہے۔ اکثر اپنی آپ بیتی لکھتے تھے۔ دو دیوان یادگار چھوڑے۔ پہلا دیوان 'گلدستۂ عشق' ان کی زندگی ہی میں مرتب ہوا تھا۔

کھُلی ہے کُنجِ قفس میں مری زباں صیّاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیّاد

اُجاڑا موسمِ گُل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیّاد

اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیّاد

دکھایا کُنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں ہم کہاں کہاں صیّاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اُڑ جاؤں گا کہاں صیّاد

الٰہی دیکھئے کیوں کر نباہ ہوتا ہے
زباں دراز ہوں میں اور بدزباں صیّاد

یہ ہے نہ قابلِ پرواز بال و پر میرے
قفس سے اُڑ کے میں اب جاؤں گا کہاں صیّاد

قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیّاد

فریبِ دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رندؔ
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیّاد

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بےگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلےٰ تیرا
تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں ہوتا تیرا

ایک عالم کو ترے نام کا ہے ورد اے دوست
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا

دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں
سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا

تو ہی نے اس کو بنایا ہے یدِ قدرت سے
تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

عاشقِ روئے پری شیفتۂ حور نہیں
جانِ جاں رندؔ ہے دیوانہ و شیدا تیرا

۴۲۔ میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

۱۷۹۷–۱۸۶۹ء

عبداللہ بیگ خاں کے فرزند تھے۔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ سال کی عمر میں دلّی کے ایک نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ اور دلّی میں آمد و رفت شروع ہو گئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی۔ فارسی کی اچھی تعلیم پائی تھی اور بچپن سے رنگین مزاجی اور رندی و فارغ بالی کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا چسکا تھا۔ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مزاج میں خودداری

اور امیرانہ ترنگ تھی۔ کہیں ملازمت نہ کی۔ آخر عمر میں بہادر شاہ ظفر نے
تاریخ تیموریہ لکھنے کا کام سپرد کیا۔ کلکتے (ایک مقدمے کے سلسلے میں) اور
رام پور کے سوا کہیں نہیں گئے۔ اردو کے بہت بڑے اور مقبول شاعر ہیں۔
ان سے متعلق اب تک متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور خود ان کی جملہ اردو
اور فارسی نظم و نثر کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز — میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں — طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا | نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں | شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن | شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں | یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا
بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات | عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا | میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی | بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی | حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز | پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی | پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی | کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں | دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے | دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا | آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ | اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا | بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا | جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے | ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں | شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن | غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار | لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا | درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد | تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ | اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہوں کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جب کرم رُخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — مِلّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی — اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمّید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جب آنکھ سے نہیں ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی　　تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　نالہ پابندِ نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں ہے تو　　پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

۴۳۔ میر علی اوسط رشک

۱۷۹۹-۱۸۶۷ء

میر سلیمان کے فرزند، فیض آباد میں پیدا ہوئے، لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ اور ان کے رنگ میں اتنا کمال پیدا کیا کہ جانشینِ ناسخ سمجھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں کربلا چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے بہت شاگرد تھے جو صاحبِ دیوان تھے۔ رشک کے تین دیوان مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ نظم مبارک، نظم گرامی اور دیوان سوم۔

جو رنج نوشتہ میں ہے کیوں کر نہ ملے گا
لکھوائیں گے نامہ تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اُس مہِ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہِ انور نہ ملے گا

ابرِ شبِ فرقت ہی بندھے آنسوؤں کا تار
اس طرح کا وقت اے مژہ تر نہ ملے گا

کاہیدگیِ جسم اگر یوں ہی رہے گی
ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

انصاف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت
اے رشکؔ اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

۴۴۔ مومن خاں مومنؔ

۱۸۰۰ - ۱۸۵۱ء

حکیم غلام بنی خاں کے فرزند تھے، دلّی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادر صاحب سے تعلیم پائی۔ طب خاندانی مشغلہ تھا۔ اسی کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ شعر و سخن کے علاوہ شطرنج اور نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ لیکن اُستاد کی پیروی نہ کی۔ معنی آفرینی اور رنگینی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ قصیدے بھی لکھے مگر کسی کی مدح نہیں کی۔ تحریک جہاد کی تائید میں مثنویاں لکھی ہیں۔ آزادہ رو اور صاحبِ طرز شاعر تھے۔ کلام چھپ چکا ہے۔

ان سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہو گا
میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہو گا

محو مجھ سا دمِ نظّارۂ جاناں ہو گا
آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہو گا

خواہشِ مرگ ہوا اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہو گا

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہو گا

کیوں کر اُمیدِ وفا سے ہو تسلّی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رُسوا کیا

زندگیٔ ہجر بھی اک موت تھی
مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے
راز مرا صبر نے افشا کیا

رحم فلک اور مرے حال پر
تو نے کرم اے ستم آرا کیا

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ہاں تنگ دہانی کا نہ کرنے کے لئے بات
ہے عذر، پر ایسا کہ میں کچھ نہیں کہتا

اے چارہ گرد قابلِ درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن بہ خدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا
رحم اس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

تھا میں برنگِ شعلۂ جوالہ بے قرار
جی خاک ہو گیا مجھے آرام جب ہوا

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا
ناصح تو میری جان نہ لے دِل گیا گیا

یہ ضعف ہی تو دم سے بھی کب تک چلا گیا
خود رفتگی کے صدمے سے مجھ کو غش آگیا

کیا پوچھتا ہے تلخیٔ الفت میں پند گو
ایسی تو لذتیں ہیں کہ تو جان کھا گیا

آہِ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی یہ کہ جی سنسنا گیا

اثر اُس کو زرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسّم ہنسی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بےگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلا
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا
بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں

ہو گئے نامِ بتاں سُنتے ہی مومن بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظّارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

وصل کی بات کب بن آئی تھی
دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

کیا تماشا ہے جو نہ دیکھے تھے
وہ تماشے دکھائے لوگوں نے

کردیا مومن اس صنم کو خفا
کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

رشک پیغام ہی عناں کش دل
نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مانعِ ظلم ہے تغافلِ یار
بختِ بد کو خبر نہ ہو جائے

رشکِ دشمن کا فائدہ معلوم
مفت جی کا ضرر نہ ہو جائے

۴۵۔ نواب مرزا شوق

۱۷۸۲ – ۱۸۷۱ء

حکیم تصدّق حسین خاں عرف نواب مرزا آغا علی خاں لکھنوی آتش کے شاگرد تھے اور اپنی متعدد اعلیٰ پایہ مثنویوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ زہرِ عشق۔ بہارِ عشق۔ فریبِ عشق۔ لذّتِ عشق۔ طرزِ بیان سلیس اور جذبات نگاری مکمّل ہے۔ زہرِ عشق کا ایک انتخاب درج ذیل ہے۔

اقربا ہو گئے، مرے آگاہ
تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

گو ٹھکانے نہیں تھے ہوش و حواس
پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ ناگہانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے اِن کو آسمان و زمیں

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دُنیا کا کارخانہ ہے

بوئے اُلفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں کُلُّ مَن عَلَیہَا فَان

موت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

زندگی بے ثبات ہے اس میں
موت عین حیات ہے اس میں

ہم بھی گر جان دے دیں کھا کر سم
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

دل کو ہمجولیوں میں بہلانا
یا مری قبر پر چلے آنا

جا کے رہنا نہ اس مکان سے دُور
ہم جو مر جائیں تیری جان سے دُور

رُوح بھٹکے گی گر نہ پائے گی
ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی

رو کے رہنا بہت طبیعت کو
یاد رکھنا مری وصیّت کو

ضبط کرنا اگر ملال رہے
میری رُسوائی کا خیال رہے

میرے مرنے کی جب خبر پانا / یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم / رکھنا اُس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم / ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی / دُور پہنچے گی میری رُسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے / لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب امیر و غریب / قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
سامنا ہو ہزار آفت کا / پاس رکھنا ہماری عزّت کا
جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں / آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منّت پہ دھیان رکھئے گا / بند اپنی زبان رکھئے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجئے گا مِرا / نام مُنہ سے نہ لیجئے گا مِرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا / ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے / سب میں رُسوا نہ کیجئے گا مجھے
رنگ دِل کے بدل نہ جائیں کہیں / مُنہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھُلے / تا کسی شخص پر نہ حال کھُلے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے / تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
رنج فرقت مرا اُٹھا لینا / جی کسی اور جا لگا لینا
رنج کرنا نہ میرا میں قربان / سُن لو گر اپنی جان ہے تو جہان
آنسو چھپکے سے دو بہا لینا / قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر / پڑھنا قرآن میری تربت پر

غنچۂ دِل مرا کھلا جانا
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے
مٹّی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے

کبھی آجائے گر ہمارا دھیان
جاننا ہم پہ ہوگئے قربان

دل میں کچھ آنے دیجیے نہ ملال
خواب دیکھا تھا کیجیے یہ خیال

مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

۴۶۔ میر ببر علی انیسؔ

۱۸۰۱ ـ ۱۸۷۴ء

میر خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے۔ دلّی میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں فیض آباد گئے، اور وہاں سے لکھنؤ آکر تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے والد کے شاگرد ہیں۔ غزل گوئی سے ابتدا کی۔ لیکن ان کو سلاموں کی شکل میں منتقل کر دیا۔ اردو کے سب سے بڑے مرثیہ نگار ہیں۔ عظیم آباد اور حیدر آباد میں معرکہ کی مجلسیں پڑھیں۔ ان کی زبان اور قدرت بیان مسلم الثبوت ہے۔ طبیعت میں انکسار اور عادتوں میں اعتدال تھا اور ان کے کلام میں بھی باوجود استادی اور قدردانی کے یہی رنگ قائم رہا۔

صبح

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

تلوار

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی ادھر اک خوں کی ابلتی ہوئی آئی

دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی

ہیرا تھا بدن رنگ زمرّد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا
پہنچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رُکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

اولاد

دولت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذّت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گُل تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے
ماں باپ کا دل غنچہ خنداں ہے اسی سے
گل ہے یہ کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
آبادیِ کاشانۂ انساں ہے اسی سے
کس طرح کھلے دل کا جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے
یہ ہے وہ عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
یہ ہے وہ نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے

وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہے جس سے　　　وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ لال زر و مال کے بدلے

موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

صولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے　　　ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے

سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے　　　گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دل بند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے

کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے　　　تلخی میں بھی جنّت کی حلاوت ہے پسر سے

خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے　　　ایّامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرامِ جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے

پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے　　　وہ چیز ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے

وہ لال ہے اُمید بڑی رہتی ہے جس سے　　　وہ دُر ہے یہ دُر جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے

پھرتا ہے جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہے اس کے

۴۷۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ

۱۸۰۳ـ۱۸۷۵ء

مرزا آغا جان کے بیٹے اور میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد تھے۔

مرثیوں کے سوا کچھ اور نہ لکھا۔ مضمون آفرینی اور موشگافی میں ماہر تھے۔
بڑے قادرالکلام مرثیہ گو تھے اور میر انیس کے مدمقابل۔ ان دونوں کے
سلسلے میں موازنہ اور المیزان جیسی کتابیں شایع ہوئیں اور عرصے تک
تنقیدی ہنگامہ گرم رہا۔ دبیر کے مرثیوں کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔

تلوار

جب مورچے پہ پیلیٔ تیغِ دو سر گئی
چنگے بھلوں کو سایے سے دیوانہ کر گئی

ہر صف میں خاک اُڑا کے ادھر سے ادھر گئی
پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی

تجویز جو لعینوں نے کی وہ مفر پڑی
اُفتاد ان سے پوچھیے یہ جن کے سر پڑی

اٹھی گری بلند ہوئی پست ہو گئی
پی پی کے مے کشوں کا لہو مست ہو گئی

ہم دل میں جب ورے آئیں گے فوجِ شریر کے
جوہر کھلیں گے طاقت برنا و پیر کے

ٹکڑے کریں گے خنجر و شمشیر و تیر کے
وارث ہیں ذوالفقار جناب امیر کے

اِک اِک کی موت آج حسامِ دو سر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکم قدر سے ہے

علی اصغر کی فرقت میں ماں کی بیتابی

بانو پچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے ایک وہ جاگتی ہے خلق خدا سوتی ہے
سر کو بھی پیٹتی ہے جان کو بھی کھوتی ہے پر عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے
پیٹتے پیٹتے بے ہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہے ہے علی اصغر کی صدا آتی ہے

سوگ کا فرش ہے اور سامنے جلتا ہے چراغ بازو میں داغِ رسن سینے میں اولاد کا داغ
جان اندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے نہ ہے زہرا کا وہ باغ
گوشہ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اسے یاد آتا ہے

ہائے اصغر نہ ترا دین ہوا مجھ سے ادا بوجھ کوئی مری گردن سے نہ اترا تیرا
نہ تری سال گرہ کی نہ ترا بیاہ کیا نہ لحد تجھ کو ملی اور نہ کفن تجھ کو ملا
ذبح تم ہو گئے سینے پہ لٹاؤں کس کو
چھوٹے چھوٹے یہ شلوکے ہیں پنہاؤں کس کو

شیریں سید الشہدا کی یاد میں

شیریں کو عجب الفت سلطانِ امم تھی ہر دم شہِ والا کی وہ مشتاق قدم تھی
آنکھ اُس کی سوئے صورتِ بانوئے عجم تھی پتلی صفتِ قبلہ نما سوئے حرم تھی

غش کرتی تھی اقرارِ امامِ دو جہان پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ صدا نور کے تڑکے اسے آنا
اور شام کو دروازے سے روتے ہوئے جانا
گہہ صبح سے مولا کے لئے فرش بچھانا
اور شام کے نزدیک بصد یاس اُٹھانا

شہ کے لئے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زمانا
جائز کیا فرزند پیمبر کا ستانا
مسلم کا مدینے سے ہوا کوفے کو آنا
آخر کو ہوئے شاہ بھی یثرب سے روانا

واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے
یاں روح نکلنے لگی شیریں کے بدن سے

تقدیر وہاں دربدر آقا کو پھراتی
شیریں یہاں در پر کبھی آتی کبھی جاتی
گھبرا کے کبھی کوہ سے نیچے اُتر آتی
رہ گیروں کو جا جا کے سرِ راہ سناتی

دنیا میں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے
لوگو تمھیں کچھ دلبر زہرا کی خبر ہے

پائی جو نہ اس نے خبر سبطِ پیمبر
دی حج سے ہوئی تارکِ لذات وہ مضطر
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسّر
سونے کے لئے فرش و زمیں دونوں برابر

اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک بدلنا بھی غرض چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تمھیں بنایا ہی یہ کیا حال
پوشاک جو میلی ہی تو اُلجھے ہوئے ہیں بال

وہ کہتی تھی نیرنگ نظر آتا ہے امسال   دریافت مجھی کو نہیں ہوتا ہے مرا حال

پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ ردا کی

اللہ بس اب خیر کرے آلِ عبا کی

۴۸۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ

۱۸۰۶ - ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفےٰ خاں ولد نواب مرتضےٰ خاں سرفراز الملک دہلی میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ پائے کی عربی و فارسی تعلیم حاصل کی۔ غدر تک دلّی میں رہے اور غالبؔ و ذوقؔ و مومنؔ کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ مومنؔ کے تو شاگرد ہی تھے۔ غدر کے بعد سے اپنی جاگیر جہانگیر آباد میں رہنے لگے۔ اردو کی طرح فارسی میں بھی صاحبِ دیوان تھے، اور حکیم مومنؔ خاں کے شاگرد۔ ایک تذکرہ گلشنِ بے خار بھی لکھا۔ جس میں شاعروں کے بارے میں مختصر مگر جچی تُلی رائیں لکھیں۔

ساقی کو میکدے میں سرِ ناو نوش ہے   صوفی کو خانقہ میں سرِ وجد و حال ہے

منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت   حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے   ہر بات منطقی کو مرادِ جدال ہے

اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں   اہلِ کلام کو ہوسِ قیل و قال ہے

ہیں بعض لوگ درپئے اسراف رات دن   بعضوں کو روز و شب سرِ توقیرِ مال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخرِ نسب لذیذ
بعضوں کو ذوق دعویٰ فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہی کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریق لجۂ بیم زوال ہے

جو ہیں مریض سیرِ چمن اُن کو بزم میں
ذکرِ شجر کبھی کبھی فکرِ مآل ہے

جی میں کسی کے خواہشِ آرائشِ لباس
دل میں کسی کے حسرتِ جاہ و جلال ہے

کوئی فدائے قامت آفت خرام ہے
کوئی خراب نرگسِ جادو مثال ہے

ناحق کسی کو شکر کسی کو شکایتیں
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

کل نغمہ گر جو مطرب جادو ترانہ تھا
ہوش و حواس و عقل و خرد کا پتا نہ تھا

حسرت سے اس کے کوچے کو کیونکر نہ دیکھتے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا میکدوں میں ہی کہ مدارس میں وہ نہیں
البتہ ایک واں دلِ بے مدعا نہ تھا

ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

دشمن کے فعل کی ہمیں توجیہ کیا ضرور
تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

کل شیفتہ سحر کو عجب حال خوش میں تھے
آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
تلوّن سے ہے تم کو مدعا کیا

کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں
کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا

کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں
کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا

کبھی تمکین صولت آفریں کیوں
کبھی الطاف جرأت آزما کیا

کبھی وہ طعنہ ہائے جاں گزا کیوں کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہرِ تسکیں پیے ہم جلوہ ہائے دل رُبا کیا
یہ سب طول اس نے سُن کر بے تکلف جواب اِک مختصر مجھ کو دیا کیا
ابھی اے شیفتہؔ واقف نہیں تم کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

۴۹۔ پنڈت دیاشنکر نسیمؔ

۱۸۱۱ - ۱۸۴۳ء

گنگا پرشاد کول کے فرزند اور کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ امجد علی شاہ کے دور میں شاہی فوج کے بخشی تھے۔ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ بندش کی چستی، اور تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت اور برجستگی کی وجہ سے دبستان لکھنؤ کی شہرت کا باعث بنے۔ ان کی مثنوی گلزار نسیم میر حسن کے سحر البیان کے ہم پلّہ قرار دی جاتی تھی اور اس بارے میں ایک زمانے میں بڑی بحثیں ہوتی تھیں۔

بکاولی کی تلاش

گل کا جو الم چمن چمن ہے یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا ‏ اور غنچۂ صبح کھل کھِلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام ‏ یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام

جاگی مُرغِ سحر کے غل سے ‏ اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی ‏ پُرآب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گُل ہوا ہوا ہے ‏ کچھ اور ہی گل کِھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل ‏ جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ‏ ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے ‏ بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گُل ‏ سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سُنبل مرا تازیانہ لانا ‏ شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون ‏ بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا ‏ اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو سو داغ ہو جائے ‏ جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا ‏ غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل ‏ مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا ہوا نہ بتلا ‏ خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے ‏ گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

۵۰۔ میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی

۱۸۱۳—۱۸۸۱ء

سیّد محمد علی لکھنوی کے فرزند۔ امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ فرنگی محل لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں آٹھ سال تک محکمہ صدر امانت میں امین رہے اور امجد علی شاہ کے دور میں محکمہ عالیہ وزارت میں میر منشی مقرر ہوئے۔ واجد علی شاہ نے تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب دیا۔ بعد کو نواب رام پور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کلب علی خاں نے رام پور بلالیا۔ فہرست تصنیفات یہ ہے۔ گلشن تعشق۔ گلستانِ سخن۔ ریاض مصنف۔ گلدستۂ امامت۔ دیوانِ اسیر۔ دیوان قصائد۔ زر کامل عیار تشہیر الحروف (فارسی)۔ فوائد مظفریہ (عربی)، مثنویات درۃ التاج، معارج الفضائل وغیرہ۔

رونقِ گلشن جو وہ رندِ شرابی ہو گیا — پھول ساغر بن گیا غنچہ گلابی ہو گیا

واہ کیا اُس گلبدن کا شوخ ہے رنگِ بدن — جامۂ آبی اگر پہنا گلابی ہو گیا

رازِ الفت کا بہت دل نے چھپایا کیا کرے — دیدۂ تر باعثِ خانہ خرابی ہو گیا

جام جس کے ہاتھ میں دیکھا ہوا اس کا مرید — مذہب اے پیرِ مغاں میرا رکابی ہو گیا

ہوں وہ مجرم دھوپ میں بیٹھا تو سایہ کے لئے — آفتاب آکر فلک سے آفتابی ہو گیا

زاہدو معلوم ہے کچھ تم کو احوالِ اسیر — زہد و تقویٰ چھوڑ کر رندِ شرابی ہو گیا

پیری میں چاہیے ہمیں ساقی شرابِ صبح / سرما میں ہے عزیز بہت آفتابِ صبح

کیوں کر جنوں میں ہم نہ کریں قصد خوابِ صبح / ہیں خندہ ہائے چاکِ گریباں جوابِ صبح

کانٹا ہے تیرے چہرۂ گلگوں کے سامنے / خورشید ہے اگرچہ گلِ انتخابِ صبح

طولِ شبِ فراق سے ہم کو یقیں ہوا / نکلے گا روزِ حشر کو اب آفتابِ صبح

بے پردہ کیا ہوا وہ رُخِ آتشیں اسیرؔ / پارے سے بھی زیادہ ہے کچھ اضطرابِ صبح

اِس غم کدہ میں جو ہے وہ آفت رسیدہ ہے / ہے صبحِ عید بھی تو گریباں دریدہ ہے

افشائے رازِ عشق کیا خامشی نے اور / بلبل مرے چمن میں زبان بریدہ ہے

ہوں وہ غنی کہ میں نے نظر سے گِرا دیا / موتی صدف میں قطرۂ اشکِ چکیدہ ہے

تن ہو نشانہ تیر کا ایسے کہاں نصیب / ناوک فگن کماں کی طرح سے کشیدہ ہے

طولِ شبِ فراق کے مضموں جو ہیں رقم / ہر شعر ہے غزل جو غزل ہے قصیدہ ہے

دیوانگانِ عشق نے کھینچی ہیں یہ جدین / صحرا تمام کاغذِ مسطر کشیدہ ہے

کب ہیں مرید اور کسی پیر کے اسیرؔ / ہم کو فقط علیِ ولی سے عقیدہ ہے

کھینچ لایا ہے قفس تک ہمیں دانا پانی / دیکھیے دانہ فلک بند کرے یا پانی

میں جو روتا ہوں تو ہنس ہنس کے وہ فرماتے ہیں / کتنے ہلکے ہو کہ تم کو نہیں پچتا پانی

گردِ غم دل میں جو اُٹھے تھے وہ سب بیٹھ گئے / مے پلائی ہمیں ساقی نے نہ چھڑکا پانی

عملِ زشت سے نفرت ہی یہاں تک مجھ کو / رو دیا میں نے جو زخموں نے چُرایا پانی

بزمِ عصمت میں ترے حور قدم کیا رکھے / مریم آئے تو ابھی اس کا ہو زہرا پانی

عمر بھر دیدۂ گریاں سے رہے اشک رواں
یہ کنواں وہ ہے نہ ٹوٹا کبھی جس کا پانی

آنکھ سے کیوں نہ بہے آنسوؤں کا بحر اسیر
نہ ملا سبطِ نبی کو لبِ دریا پانی

۵۱ - میر مہدی مجروحؔ

۱۸۳۳ - ۱۹۰۲ء

میر مہدی حسین خلف میر حسین فگارؔ دہلوی مرزا غالبؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ پانی پت میں عرصے تک قیام کیا۔ مرزا غالبؔ نے ان کے نام کئی خطوط لکھے جو مشہور ہوئے۔ غالبؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے کلام میں نازک خیالی اور معنی یابی کی فراوانی تھی۔ دلّی میں انتقال ہوا۔

بے عدو وعدہ قتل کا نہ ہوا
ظلم بھی حسبِ مدّعا نہ ہوا

روکنا اس کا سہل تھا لیکن
شوق ہی جرأت آزما نہ ہوا

یوں نکلتا نہ ان کی محفل سے
ہائے میں اپنا مدّعا نہ ہوا

کام آئی شکر لبی ان کی
جب مرا لب ملا جدا نہ ہوا

ظلم بے جا ہیں اس کے سب لیکن
کون یہ کہہ سکے بجا نہ ہوا

ہم بھی پابندِ وضع تھے کتنے
مر گئے ان سے پر گلا نہ ہوا

اس کے تمکینِ ناز سے مجروحؔ
لطف کچھ چھیڑ چھاڑ کا نہ ہوا

اپنی ہستی ہے خواب کی صورت
بود ہے یہ حباب کی صورت

رال ٹپکے گی شیخ صاحب کی
نہ دکھاؤ شراب کی صورت

شیخ رندوں کو حشر میں بھی خدا
نہ دکھائے حباب کی صورت

مر گئے پر نظر میں پھرتی ہے
اسی خانہ خراب کی صورت

روئے جاناں کے درمیاں مجروحؔ
ہوں میں حائل نقاب کی صورت

میں آہ ہوں تو خونِ جگر میں طپیدہ ہوں
میں زخم ہوں تو سودۂ الماس دیدہ ہوں

کیوں کر رہوں میں چین سے کیا آرمیدہ ہوں
میں بحرِ غم میں کشتیِ طوفاں رسیدہ ہوں

طوفانِ جہل نے مرا جوہر مٹا دیا
میں اِک کتاب خوب ہوں پر آب دیدہ ہوں

ایذا کبھی کسی کی گوارا نہیں مجھے
ہوں خارِ رہ تو پاؤں میں اپنے خلیدہ ہوں

پورا ہوا نہ کوئی زمانے سے اپنا کام
نالہ ہوں میں اگر تو بلب نارسیدہ ہوں

صحرا و شہر میں مرا مسکن کہیں نہیں
اس دام گہ میں طائرِ رنگ پریدہ ہوں

مجروحؔ میرے حال کو کیا پوچھتے ہو تم
میں کیا ہوں اِک ستم کش آفت رسیدہ ہوں

شغلِ اُلفت کو جو احباب بُرا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں

کیا ہے آبِ دمِ خنجر سے وہ تیرے افزوں
جس کو تعریف سے سب آبِ بقا کہتے ہیں

جان دینے کے سوا اور بھی تدبیر کریں
ورنہ یہ بات تو ہم اس سے سدا کہتے ہیں

دے دیا دل ہی تو بدگوئی کا شکوہ کیا ہے
آپ جو کچھ مجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

سیم تن اس کو کوئی کہنے لگا کوئی پری
بولا مجروحؔ سے پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں

۵۲ - سیّد میرزا تعشقؔ

۱۸۲۳ - ۱۸۹۱ء

میّد مرزا اُنس کے فرزند تھے۔ لکھنؤ کے مشاہیر مرثیہ نگاروں میں سے ہیں۔ شعر و سخن کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ ایک عرصے تک کربلا میں رہے۔ اور اپنے بھائی عشق کی وفات کے بعد ہندستان واپس ہوئے اور شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد تھے اور انیسؔ بھی ان کو چاہتے تھے۔ غزل اور مرثیہ دونوں میں اُستادی کا مرتبہ حاصل تھا۔

شب کو کیا کیا باغ میں جلوے تمھارے ہو گئے
چاندنی کے پھول جو توڑے ستارے ہو گئے

برق موجیں بن گئیں موتی شرارے ہو گئے
دل جلے جب دفن دریا کے کنارے ہو گئے

دور سے جو آج مدّت بعد چار آنکھیں ہوئیں
آبدیدہ ہو کے باہم کچھ اشارے ہو گئے

رات کو تیرا مجھے دھوکا ہوا اے ماہ نو
بے خودی میں چاند سے کیا کیا اشارے ہو گئے

اس کے آنے سے تو بہتر ہے کہ آئے وقت نزع
کچھ تو حسرت کی نگاہوں سے نظارے ہو گئے

اے تعشق آنسوؤں میں جب ڈبویا عشق نے
تھے ہمارے آشنا جتنے کنارے ہو گئے

مرثیہ در حال حضرت حُرؒ

تلوار

حُر نے تلوار کا اک ہاتھ جدھر چھوڑ دیا　　دل کو چھوڑا نہ سلامت نہ جگر چھوڑ دیا
کس دن اس برق کی گرمی نے اثر چھوڑ دیا　　کوچۂ زخم کا سوزن نے گزر چھوڑ دیا
دود بن بن کے نفس کی جو ہوا آتی ہے
دہنِ زخم سے اُف اُف کی صدا آتی ہے

جب پڑی ضربِ دلِ فوجِ ستم گر ٹوٹا　　کشتیِ عمر لگی ڈوبنے لنگر ٹوٹا
دب کے ٹوٹا کہیں نیزہ کہیں خنجر ٹوٹا　　چھوٹ قبضے کی پڑی دھوپ میں اختر ٹوٹا
قبضۂ تیغ بہم مثل نہیں رکھتے ہیں
ہاتھ میں پھول یونہی ماہ جبیں رکھتے ہیں

اس کے پانی سے ہوا لشکرِ اظلم ٹھنڈا　　آگ جلتی ہوئی زخموں میں ہو مرہم ٹھنڈا
مہر بھی ہے صفتِ قطرۂ شبنم ٹھنڈا　　باڑھ کی آنچ سے ہو جائے جہنم ٹھنڈا

حلقے زرہوں کے جو داغوں کی طرح جلتے ہیں
پھول ڈھالوں کے چراغوں کی طرح جلتے ہیں

آب شمشیر سے کہتی ہے جراحت کی تری
اس کے دم سے ملک الموت کی ہے ناموری
دم بھر کتے ہیں عجب باڑھ کی ہے جلوہ گری
ہر طرف مانگ نکالے ہوئے پھرتی ہے پری

چھوٹ جوہر کی سماں نور کا دکھلاتی ہے
دھوپ میں چھاؤں ستاروں کی نظر آتی ہے

کبھی مغفر میں کبھی کاسۂ سر میں ڈوبی
کبھی پتلی کی طرح دیدۂ تر میں ڈوبی
سینے سے دل میں گئی دل سے جگر میں ڈوبی
کیں ستم گر سے یہ باتیں تو سپر میں ڈوبی

کیا کہوں کیا ہے مری ضرب کڑی او ظالم
رات چھوٹی ہے کہانی ہے بڑی او ظالم

۵۳۔ سید محمد محسن کاکوروی

۱۸۲۵-۱۹۰۵ء

سید محمد محسن ولد حسن بخش علوی قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کلام ہادی علی شاگرد برق لکھنوی کو دکھایا۔ اس کے بعد نعت گوئی میں طرزِ خاص کے موجد اور استاد ہوئے۔ مین پوری میں وکالت کرتے تھے۔ سوز و گداز اور زبان کی صفائی کی وجہ سے کلام بہت مقبول ہوا۔ کئی مثنویاں تجلّی کعبہ، چراغِ کعبہ، فغانِ محسن وغیرہ لکھیں۔ لیکن نعتیہ قصائد کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔

عشق و محبّت کی بے چینی کا نقشہ

ایک نظر مہر کی مجھ پر ساقی | ماہرو آئینہ پیکر ساقی
مہرباں تشنہ لبوں پر ہو جا | دل کی لہروں کا سمندر ہو جا

کشتیِ مے نہ چلے میرے بغیر | میرے دریا تیرے بیڑے کی خیر
کر دے سرشار مجھے جی بھر کے | دے صراحی پہ صراحی بھر کے

ہیں یہ کیا رنگ تمھارے محسن | سُست کیوں ہو مرے پیارے محسن
نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری | یار کیا ہو گئی حالت تیری

حیف حالت تری دکھ پائی ہوئی | ہائے صورت تری مرجھائی ہوئی
زردی چھائی ہوئی رخساروں پر | سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

مُردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو | اپنی جاتی ہوئی دُنیا دیکھو
چھپ گیا چاند ستارا ہو کر | اُڑ گیا آئینہ پارا ہو کر

ہر دم اک رنگ بدلتا ہے کیوں | شمع کی طرح سے جلتا ہے کیوں
رنگ اُڑ اُڑ کے بکھر جانے لگا | ناتوانی کو بھی غش آنے لگا

بند آنکھیں کیے روتے دیکھا | رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
کوہ پر جا کے اگر سر مارے | کوہ کن بھی تجھے پتھر مارے

باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو | آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
کبھی ملتے ہو تو بیگانے سے | کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے
آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے | باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے

نجد میں تیرا گلا ہوتا ہے — قیس لیلیٰ پہ خفا ہوتا ہے

کسی بت نے تجھے حیران کیا — کسی کافر نے مسلمان کیا

بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھ کو — کیا ہوا میرے کنھیا تجھ کو

خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی — ہیں مری جان یہ آہیں کیسی

بگڑی کیوں اے مرے بسمل چتون — یاد آئی کوئی قاتل چتون

عشق گیسو نے یہ عقدہ کھولا — سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا

جال پھیلائے ہیں منتر والے — بال کھولے ہوئے گھونگر والے

جان لیتے ہیں نکھرنے والے — تم سلامت رہو مرنے والے

دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں — جان کی فکر مرے جانی کیوں

آبرو کی تجھے پروا کب تک — ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک

ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو — تم تو بے مے پیئے متوالے ہو

سو کہیں ایک نہ مانی آخر — مٹ گئی تیری جوانی آخر

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک — روشنی شمع سحر کی کب تک

دلِ ناشاد کو رکھ قابو میں — نہ سہی یار نہ ہو پہلو میں

بس مجھے آتے ہیں چکر ساقی — لے مرے ہاتھ سے ساغر ساقی

ہاتھ لینا مجھے غش آتا ہے — دل کہیں اور لئے جاتا ہے

تیری محفل کا یہی طور رہے

دور جب تک رہے یہ دور رہے

بادل

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل / تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل

خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل / رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

شاہدِ گل کا لئے ساتھ ہے ڈولا بادل / برق کہتے ہیں مبارک تجھے سہرا بادل

سطحِ افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی / رُوپ بجلی کا سُنہرا ہے روپہلا بادل

چرخ پر بجلی کی چل پھر سے نظر آتا ہے / سبزہ چمکائے ہلاتا ہوا برچھا بادل

جب تلک برج میں جمنا ہے یہ کھلنے کا نہیں / ہے قسم کھائے اُٹھائے ہوئے گنگا بادل

بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں / وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل

چشمۂ مہر ہے عکسِ درِ گل سے دریا / پرتوِ برق سے ہے سونے کا بجرا بادل

میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوش و خروش / کسی بے درد کو دکھلائے کرشما بادل

دلِ بے تاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی / چشمِ پُر آب کا ہے ایک کرشما بادل

طپشِ دل کا اُڑایا ہوا نقشہ بجلی / چشمِ پُر آب کا دھویا ہوا خاکا بادل

اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے / میری آنکھوں کا ہے اُترا ہوا صدقا بادل

کچھ ہنسی کھیل نہیں جوششِ گریہ کا ضبط / یہ مرا دل ہے یہ میرا ہے کلیجا بادل

راجا اندر ہے پری خانۂ مے کا پانی / نغمۂ نے کا سری کشن کنھیا بادل

جوش پر رحمتِ باری ہے چڑھاؤ خُمِ مے / چشمکِ برق سے کرتا ہے اشارا بادل

دیکھتا گر کہیں محسنؔ کی فغان و زاری / نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

۵۴۔ گردھاری پرشاد باقیؔ

۱۸۲۸ء - ۱۸۹۶ء

گردھاری پرشاد ولد نرہری پرشاد حیدرآباد میں پیدا ہوئے، سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی اور اردو سب زبانوں کے ماہر اور عالم تھے کئی کتابیں لکھیں جن میں فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں کی اعلیٰ پائے کی تالیفات شامل ہیں۔ اکثر چھپ چکی ہیں۔ محبوب علی خاں آصفؔ ان کے بڑے قدردان تھے۔ راجا محبوب نواز وفت کے خطاب مناصب اور جاگیروں سے سرفراز کیا۔ ''اُستادِ کل'' فیضؔ کے شاگرد اور بہت علم دوست تھے۔

قاصد اتنا ہی تو کہہ دے مجھ سے — خط کو پڑھوا کے سُنایا دیکھا

عرض کی میں نے اِدھر تو دیکھو — کہا مُنہ پھیر کے دیکھا دیکھا

دل میں دُنیا کا تماشا دیکھا — موجزن کوزے میں دریا دیکھا

راہ میں کل وہ یکایک جو ملا — مری جانب کو نہ اصلا دیکھا

جس نے دیکھا دہنِ جاناں کو — باقیؔ عنقا کو ہے گویا دیکھا

پھر چاہِ ذقن دکھا رہے ہو — پھر ہم کو کنوئیں جھنکا رہے ہو

مجھ کو جو بتو رُلا رہے ہو — اُلٹی گنگا بہا رہے ہو

کیا آپ کا سر پھرا ہے واعظ — مستوں کا جو سر پھرا رہے ہو

دُنیا میں عبث ہے فکرِ عقبیٰ　　　دو دن کے لئے تو آ رہے ہو

کُفر ہے خالِ رخِ جاناں کو کہتے ہیں ہلال
شاعروں نے جھوٹ ہندو کو مسلماں کر دیا
قد ہے طوبیٰ، رُخ ہے جنّت، لب ہیں خرمائے بہشت
حسُن نے تجھ کو سراپا باغِ رضواں کر دیا

کہا شہ نے نہیں کوئی رفیق اب　　　فقط ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
دیا ہے اپنا سر میں نے خوشی سے　　　قضا ہے یا رضا ہے اور میں ہوں

۵۵۔ امیر احمد مینائیؔ لکھنوی

۱۸۲۸ تا ۱۹۰۰ء

کرم احمد مینائی کے فرزند لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ فرنگی محل میں تعلیم پائی اور امیرؔ سے مشورۂ سخن کیا۔ واجد علی شاہ کے یہاں ملازم ہوئے، اور دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کیں۔ ابتدائی مجموعۂ کلام غیرت بہارستان ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا۔ اس کے بعد امیرؔ کاکوری پہنچے اور وہاں محسنؔ کاکوروی کی صحبت میں نعت گوئی کا ذوق پیدا ہوا۔ جب ان کے اُستاد اسیرؔ رام پور گئے تو امیرؔ بھی وہیں ملازم ہو گئے۔ اس دَور کا کلام مراۃ الغیب کے نام سے شایع ہوا۔ نواب

کلب علی خاں نے ملک الشعرا کا خطاب اور خلعت عطا کیا۔ تذکرہ کاملان رام پور اور امیر اللغات اسی زمانے میں مرتب ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں میر محبوب علی خاں آصف کی طلبی پر حیدر آباد گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی کتابوں اور نظموں کے نام یہ ہیں۔ بہارِ ہند۔ نورِ تجلّی۔ ابرِ کرم۔ صبحِ ازل۔ شامِ اودھ۔ خیابان آفرینش۔ محامد خاتم النّبیین۔ صنم خانۂ عشق۔ شعلۂ جوالہ وغیرہ

آنکھوں میں نور تیرا دل میں سُرور تیرا
دروازے سے ہے گھر تک سارا ظہور تیرا

اے چشمِ شوق وہ تو ہر رنگ میں ہے ظاہر
اب بھی جو تو نہ دیکھے تو ہے قصور تیرا

مدہوشِ عشق ہو کر جا بزمِ معرفت میں
پردہ نہ بیچ میں ہو غافل شعور تیرا

میں آئینہ ہوں تیرا تو آئینہ ہے میرا
تجھ میں ظہور میرا مجھ میں ظہور تیرا

خضرِ رہِ مقصود اگر دل نہیں ہوتا
منزل کا پتا سیکڑوں منزل نہیں ہوتا

گردن تنِ بسمل سے جدا ہو گئی کب کی
گردن سے جُدا خنجرِ قاتل نہیں ہوتا

فریاد بھی کرتا ہوں تو اللہ سے اپنے
اس در کے سوا میں کہیں سائل نہیں ہوتا

یہ شعر وہ فن ہے کہ امیرؔ اس کو جو برتو
حاصل یہی ہوتا ہے کہ حاصل نہیں ہوتا

غنی ساتھ دُنیا سے کیا لے گیا
مگر جو کسی کو دیا لے گیا

بڑی پیچ در پیچ تھی راہِ دیر
خدا ہم کو لایا خدا لے گیا

عجب ترکِ غمزہ بھی چالاک تھا
لگاوٹ سے ہم کو لگا لے گیا

ہر جام میں ہے جلوۂ مستانہ کسی کا
میخانہ ہمارا ہے جلو خانہ کسی کا

فرہاد پہ کیا گزری جو مجھ پہ نہیں گزری
میں اپنے سوا کیوں کہوں افسانہ کسی کا

اے طالعِ بیداد میں ہوتا ہوں خبردار
پہلو سے مرے ہو نہ جدا شانہ کسی کا

بکلا ہے کسی شمع جہاں سوز کی دُھن میں
خورشید قیامت بھی ہے پروانہ کسی کا

کیا تم سے کہوں دل کی خرابی کا میں احوال
برباد ہوا اللہ گھر ایسا نہ کسی کا

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

کون سی جا ہے جہاں جلوہ معشوق نہیں
شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

میرے ہی دل پہ گرے کاش یہ بجلی بن کر
اے فلک آہ میں اتنا ہی اثر پیدا کر

مرکز عشق ہے دردِ تہ پیمانۂ عشق
آسماں ظرف برآوردۂ میخانۂ عشق

ہم وہ فرہاد تھے کاٹا نہیں صورت سے پہاڑ
حسن کا گنج لیا کھود کے ویرانۂ عشق

طور پر کہتی ہے یہ شمعِ تجلی کی زباں
سُرمۂ حسن تھا خاکستر پروانۂ عشق

کیا رنگ جہاں کے ہو رہے ہیں
دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں

آئے گی نہ پھر کے عمر رفتہ
ہم مفت میں جان کھو رہے ہیں

ٹھیرو دم نزع دو گھڑی اور
دو چار نفس ہی تو رہے ہیں

ارباب کمال چل بسے سب
سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

بلائیں لیتی ہے پھر پھر کے گردِ نومیدی
یہ کس کے در پہ الٰہی اُمیدوار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

یہ تو میں کیوں کر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں

کِس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نوگرفتاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اُٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہگاروں میں ہوں

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے

ساری دُنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دُنیا چھوڑ دی جن کے لئے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے ہیں اس دن کے لئے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیرؔ
بھیجتے تحفہ مؤذّن کے لئے

جو کچھ سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے
میں روتا ہوں اُن کو ہنسی سوجھتی ہے

یہ آتا ہے جی میں کہ کوثر کو چلیئے
خرابات میں دور کی سوجھتی ہے

جفا کو وفا کیوں نہ سمجھوں میں ناصح
محبّت میں اچھی بُری سوجھتی ہے

بُری ہو نہ قسمت الٰہی کسی کی | کہ جو سوجھتی ہے بُری سوجھتی ہے
امیرؔ ایسے ویسے تو مضموں ہیں لاکھوں | نئی بات کوئی کبھی سوجھتی ہے

۵۶- نواب میرزا خاں داغؔ

۱۸۳۱ تا ۱۹۰۵ء

نواب شمس الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے فرزند تھے۔ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔ لال قلعہ میں پرورش پائی۔ ذوق سے مشورۂ سخن کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور گئے۔ نواب رام پور کے ساتھ حج کے لئے گئے۔ ان کی وفات کے بعد رام پور سے نکلے۔ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد گئے۔ میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس ان کے شاگرد ہوئے اور ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک کے خطاب دیئے اور گرانقدر وظیفہ مقرر کیا۔ آخر دم تک عزت اور وقار سے زندگی بسر کی اور وہیں وفات پائی۔ کلام کے کئی مجموعے گلزارِ داغ۔ آفتاب داغ۔ فریادِ داغ۔ مہتاب داغ۔ یادگارِ داغ شایع ہو چکے ہیں۔ زباں کی لطافت اور خیالات کی رنگینی میں بے نظیر شاعر تھے۔

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا | حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا
نہ ہمت، نہ قسمت، نہ دل ہے، نہ آنکھیں | نہ ڈھونڈا، نہ پایا، نہ سمجھا، نہ دیکھا
تری یاد ہے یا ہے تیرا تصور | کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

کتنی فرحت فزا تھی بوئے وفا — اس نے دل کو جلا کے دیکھ لیا
لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے — حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا
کبھی غش میں رہا شبِ وعدہ — کبھی گردن اُٹھا کے دیکھ لیا
جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا — بار ہا آزما کے دیکھ لیا
داغؔ نے عاشقی کا خوب مزا — جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا

کیا خاک کروں ان سے تغافل کی شکایت — یہ حال ہی ایسا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
میں وضع کا پابند ہوں گر جان بھی جائے — جب کوئی بلائے نہیں آتا نہیں جاتا
یہ داغؔ مٹائے نہیں مٹتا نہیں مٹتا — یہ دردِ محبت نہیں جاتا نہیں جاتا

حسینوں کی جفا کیسی وفا کیا — جو دل آیا تو پھر اچھا بُرا کیا
یہ سُنوایا فغانِ بے اثر نے — کرے گا اور تو اس کے سوا کیا
کبھی تڑپا کے دل پر ہاتھ رکھا — کبھی کہنا اسے یہ ہوگیا کیا
ڈریں کیوں پرسشِ روزِ جزا سے — جو پوچھے ہم کو اس کا پوچھنا کیا

ہم نے ان کے سامنے اوّل تو خنجر رکھ دیا — پھر کلیجا رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
منصفی ہو تو غضب نا منصفی ہو تو ستم — اس نے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا
آتشِ دوزخ پہ ہوگا آتشِ تر کا گماں — گر کسی میکش نے اپنا دامنِ تر رکھ دیا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

دوستی کا ہے زمانے میں بھروسا کس پر
تو مجھے چھوڑ چلا اے دلِ شیدا کس پر

امتحاں نالۂ دل کا تو دکھا دوں لیکن
یہ تو سوچو کہ فلک ٹوٹ پڑے گا کس پر

دے دیا اس کے مریضوں کو خدا نے بھی جواب
آپ بھولے ہوئے بیٹھے ہیں مسیحا کس پر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر
دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

سیرِ خزاں بھی دیدۂ عبرت نگر کرے
کیا کی جو کی بہار و گل و گلستاں کی سیر

دلّی میں پھول والوں کی ہے ایک سیر داغ
بلبلے ہیں ہم نے دیکھ لی سارے جہاں کی سیر

چوٹ کھا نا دلِ حزیں نہ کہیں
درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں

موت اسی آستاں پہ آجائے
صرف سجدہ ہو پھر جبیں نہ کہیں

نہ کرو امتحانِ مہر و وفا
آئے اس جھوٹ پر یقیں نہ کہیں

قتل جس کا تمھیں ہے مدِّ نظر
وہ گنہ گار ہوں ہمیں نہ کہیں

داغ پھر تاک جھانک کرتے ہیں
اب گھرے اب پھنسے کہیں نہ کہیں

دل لگی ان کی دل لگی ہی نہیں
رنج بھی ہے فقط ہنسی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے | کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
جان کیا دوں کہ جانتا ہوں میں | تم نے یہ چیز لے کے دی ہی نہیں
لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد | ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتا | وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں | ناز والے نیاز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھے | وہ نشیب و فراز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں | لطف عمرِ دراز کیا جانیں
پوچھئے میکشوں سے لطف شراب | یہ مزہ پاک باز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے | آپ بندہ نواز کیا جانیں

تدبیر سے قسمت کی بُرائی نہیں جاتی | بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی
یارب کوئی آفت تھا محبت کا پتنگا | وہ آگ لگی ہے جو بجھائی نہیں جاتی
گرتی ہے نشیمن پہ مرے کوند کے بجلی | صیاد کے گھر آگ لگائی نہیں جاتی
مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد | کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

زمانہ بتوں پر فدا ہو رہا ہے | خدا کی خدائی میں کیا ہو رہا ہے
ستم ہو کے عذرِ جفا ہو رہا ہے | وہ کیا ہو رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے
دھڑکتا ہے دل کانپتا ہے کلیجا | ادا اس طرح مدعا ہو رہا ہے

ستم ہو جو کم کم تو ہم سہتے جائیں — مگر وہ تو بے انتہا ہو رہا ہے
جگت آشنا داغ ملتا تھا سب سے — مگر اب تو وہ آپ کا ہو رہا ہے

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدّعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — مجھ کو اس سے سوا دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب — نقش اپنا جما دیا تو نے
مجھ گنہ گار کو جو بخشش دیا — تو جہنّم کو کیا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تو نے

۵۷۔ ضامن علی جلال

۱۸۳۴–۱۹۰۹ء

سید ضامن علی ولد حکیم اصغر علی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ برق اور رشک کے تلامذۂ رشید میں سے تھے۔ شعر و سخن کے علاوہ علم و فضل اور نثر نگاری سے بھی لگاؤ تھا۔ تنقیح اللغات۔ افادہ تاریخ۔ رسالہ عروض، سرمایہ زبان اردو جیسی کتابیں لکھیں۔ اردو میں تین۳ دیوان بھی یادگار چھوڑے۔

جذبِ دل کھینچ لے دست و گریباں ہو کر
دے جگہ یار کو پہلو میں رگ جاں ہو کر

خوش نگاہوں کے کرشمے کوئی ہم سے پوچھے
آنکھ میں کرتے ہیں گھر آنکھ سے پنہاں ہو کر

دستِ وحشت سے کہوں گا کہ اسے بھی کر چاک
دل مجھے تنگ کرے گا جو گریباں ہو کر

حسرتِ ناوکِ قاتل میں جو دل بھر آیا
آنسو آنکھوں میں کھٹکنے لگے پیکاں ہو کر

نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ
روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہو کر

ہائے اس شوخ کی شرمندگیِ جور و ستم
مار ڈالا ہمیں ظالم نے پشیماں ہو کر

محفلِ یار سے کیوں کر نہ نکالے جاتے
ہم گئے تھے ہمہ تن حسرت و ارماں ہو کر

بے وفائی میں نہ تھا یار سے کم عہدِ شباب
چل دیا صبح کو اک رات کا مہماں ہو کر

نہ رہے ہم سے سیہ بخت تو کیا غم ہے جلالؔ
دیکھئے رہتی ہے کس کی شبِ ہجراں ہو کر

اس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے

کسی بے درد کو میں حال سُنا لوں اپنا
نالہ خاموش رہے چپ ابھی فریاد رہے

یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سو داغ
سو وفائیں مری اور اک نہ اسے یاد رہے

نامرادوں کی ہوئیں آج مرادیں پوری
ہم کو ناشاد لقب اس نے دیا شاد رہے

روح جنت میں نہ دل ہم میں نہ ہم مدفن میں
تیرے آوارہ پسِ مرگ بھی آباد رہے

اب کسی سے یہ کہیں گے کہ ہمیں رنج ہی دے
شاد ہونے کی تمنا میں تو ناشاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ تیری وفاؤں کو جلالؔ
یہ غنیمت ہے کہ جور اپنے انھیں یاد رہے

۵۸- الطاف حسین حالیؔ

۱۸۳۷ — ۱۹۱۴ء

خواجہ الطاف حسین ولد خواجہ ایزد بخش انصاری پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دلّی آ گئے۔ پہلے شیفتہ سے اور بعد کو مرزا غالب سے مشورۂ سخن کیا۔ پہلے قدیم طرز کی شاعری کرتے تھے۔ سرسید کی ملاقات کے بعد رنگ بدل گیا۔ مسدس مدوجزر اسلام لکھا۔ پھر دوسری قومی نظمیں لکھیں۔ اردو کے بہت بڑے نثر نگار تھے۔ مجالس النسا، حیاتِ سعدیؔ۔ حیاتِ جاوید۔ یادگار غالب اور مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ اردو کا دیوان بھی شایع ہو چکا ہے۔

امید سے خطاب

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بُجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو

ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دَم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

زلیخا کی غم خوار ہجراں میں تھی تو
دل آرام یوسف کی زنداں میں تھی تو

مصائب نے جب آن کر ان کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے

اُکھڑتے دِلوں کو جمایا ہے تو نے
اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی

تجھی پر ہے بنیاد نظمِ جہاں کی
نہ ہو تو۔ تو رونق نہ ہو اِس دُکاں کی

تگا پو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رواروہے ہر قافلے میں تجھی سے

قصیدہ عرضِ حال بہ جنابِ سرورِ کائنات صلعم

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتّی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرصۂ تیغِ جہلا و سفہا ہے

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیں داروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے برسوں
اس قوم کا اک ایک گھر اب بزمِ عزا ہے

چاؤش تھے للکارتے جن رہ گزروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ خدا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے

ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت
واں قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے

سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحّم
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے

کر حق سے دعا امّتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

امّت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دل دادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبّت تری عترت کی ولا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرّف
اب تک وہی قبلہ تری امّت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

کل دیکھئے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزّت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزّت کی سدا ہے

عزّت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلّت میں مزا ہے

ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حدِّ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

غزل

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا۔ نہ لگانا۔ ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدرشناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستان گل کی خزاں میں نہ سُنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دل چسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رُلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیّرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

۵۹۔ اسمٰعیل میرٹھی

۱۸۴۴-۱۹۱۷ء

محمد اسمٰعیل صدیقی ولد پیر بخش میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی

تکمیل کے بعد نارمل اسکول میں شریک ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہوکر
رُڑکی کالج میں داخل ہوئے۔ لیکن دل نہ لگا اس لئے مدرسی کا پیشہ اختیار
کیا اور سہارن پور اسکول میں ہیڈ مولوی رہے پھر انسپکٹر مدارس ہوگئے۔
اوائل عمر سے شعر وسخن کا ذوق تھا۔ مرزا غالب سے خاص عقیدت تھی
محکمۂ تعلیمات کی ملازمت کے باعث بچوں کے لئے نظمیں لکھنے لگے اور
اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ اب تک اردو ادب میں ان کا مدِّمقابل
نہ پیدا ہوسکا۔

گرمی کا موسم

مئی کا آن پہنچا ہے مہینا
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینا

بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا
ہوا پیروں تلے پوشیدہ سایا

چلی لُو اور تڑاقے کی پڑی دھوپ
لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ

زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے
کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے

درو دیوار ہیں گرمی سے تپتے
بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے

پرندے اُڑکے ہیں پانی میں گرتے
چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے

درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں
مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں

نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی

نہ پنکھا ہے نہ ٹٹّی ہے نہ کمرہ
ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ

امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

ریل گاڑی

حیوان ہے وہ نہ انساں جن ہے نہ وہ پری ہے
سینے میں اس کے ہر دم اِک آگ سی بھری ہے

کھاپی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھوئیں اُڑا کر غصّہ اُتارتی ہے

وہ گھورتی گرجتی بھرتی ہے اِک سپاٹا
ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اس نے کاٹا

آتی ہے شور کرتی جاتی ہے غل مچاتی
وہ اپنے خادموں کو ہے دور سے جگاتی

بے خوف بے محابا ہر دم رواں رواں ہے
ہاتھی بھی اس کے آگے اک مور ناتواں ہے

آندھی ہو یا اندھیرا ہے اس کو سب برابر
یکساں ہے نور و ظلمت اور روز و شب برابر

اُتر سے لے دکن تک پورب سے لے پچھاں تک
سب ایک کر دیا ہے پہنچی ہے وہ جہاں تک

بجلی ہے یا بگولا۔ بھونچال ہے کہ آندھی
ٹھیکے پہ ہے پہنچتی بچوں کی ہے وہ باندی

ہر آن ہے سفر میں کم ہے قیام کرتی
رہتی نہیں معطّل۔ پھرتی ہے کام کرتی

پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہنچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اس نے سوداگری کے تن میں
ہر چیز سے نرالی ہے چال ڈھال اس کی
پاؤ گے صنعتوں میں کمتر مثال اس کی
برکت سے اس کی بے پر پردار بن گئے ہیں
ملک اس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں
ہم کہہ چکے مفصل جو کچھ ہے کام اس کا
جب جانیں تم بتا دو بن سوچے نام اس کا
جی ہاں سمجھ گیا میں پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو آگرے سے آتی ہے ریل گاڑی

بچپن میں خدا کی یاد

اے زمیں آسمان کے مالک
ساری دُنیا جہان کے مالک
تن بدن اور جان کے مالک
میں نہیں جانتا کہاں ہے تو
روز سنتا ہوں سب سے تیرا نام
تو بناتا ہے سب کے بگڑے کام
تو ہی دیتا ہے رات دن آرام
جانتا ہوں کہ مہرباں ہے تو
ذکر تیرا ہر اک زباں پر ہے
تیرا چرچا ہمیشہ گھر گھر ہے
تو سمایا دلوں کے اندر ہے
چار ہم ہیں تو پانچواں ہے تو

ندی نالے پہاڑ اور میداں پھول پتے درخت اور حیواں
تیری کاری گری کے ہیں یہ نشاں ہم نے مانا کہ بے نشاں ہے تو

غزلیں

کام اگر حسبِ مُدعا نہ ہوا تیرا چاہا ہوا بُرا نہ ہوا
خاک اُڑتی جو ہم خدا ہوتے بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا
سب جتایا کیے نیاز قدیم وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
رخشِ ایّام کو قرار کہاں اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا
کیا کھلے جو کبھی نہ تھا پنہاں کیوں ملے جو کبھی جُدا نہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اُٹھا کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
جو گدھا خوئے بد کی دَلدل میں جا پھنسا پھر کبھی رہا نہ ہوا
تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا میرا کیا تھا ہوا ہوا نہ ہوا
رہ روِ مسلکِ توکّل ہے وہ جو محتاج غیر کا نہ ہوا

وہی کارواں وہی قافلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی شکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اُداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی نقص ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بلبلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی کِذب ہے وہی جھوٹ ہے وہی جرعہ ہے وہی گھونٹ ہے
وہی جوش ہے وہی ولولہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو ہے نوا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے — پھر چمن اور آشیانہ اور ہے
ہاں دلِ بیتاب چندے انتظار — امن و راحت کا ٹھکانہ اور ہے
شمع پھیکی رات کم محفل اُداس — اب مغنّی کا ترانہ اور ہے
اے جوانی تو کہانی ہو گئی — ہم نہیں وہ یا زمانہ اور ہے
جس کو جانِ زندگانی کہہ سکیں — وہ حیاتِ جاودانہ اور ہے
جس کو سُن کر زہرہ سنگ آب ہو — آہ وہ غمگیں فسانہ اور ہے
وا اگر سمعِ رضا ہو تو کہوں — ایک پندِ مشفقانہ اور ہے
اتفاقی ہے یہاں کا ارتباط — سب ہیں بیگانے یگانہ اور ہے

۶۰۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار

۱۸۴۶ء—۱۹۰۲ء

پنڈت رتن ناتھ در لکھنؤ کے ایک کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔

اودھ پنچ کے مضامین کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ اودھ اخبار کے ایڈیٹر
ہوئے، اور اسی میں فسانۂ آزاد کو بالاقساط شایع کیا۔ متعدد ناول کامنی،
خدائی فوجدار، پی کہاں وغیرہ لکھے۔ ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد آکر مہاراجا
کشن پرشاد کی مصاحبت اور ملازمت اختیار کی اور یہیں انتقال کیا۔
شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل نہیں کی تاہم غزلیں، قصیدے اور
مثنویاں لکھیں۔ ایک مثنوی تحفۂ سرشار مشہور ہے۔

کس دن شبِ غم جان کو آفت نہیں ہوتی
کب شام سے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی

اللہ ہمیں عشق کے پھندے سے نکالے
دم توڑتے ہیں قطع محبت نہیں ہوتی

اُلٹی ہی تجھے سوجھتی ہے اے فلک دوں
سیدھی کبھی تجھ سے مری قسمت نہیں ہوتی

نشہ کے لال لال وہ ڈورے
جس پہ نرگس کے پڑتے ہیں ڈورے

ناک میں بھی وہ نور کا ترکا
چشم زہرہ میں جس کی جھلکے ضیا

اور گلے میں وہ نور کی ہیکل
دیکھ کر جس کو جالی ہو بے کل

کاندھوں پر وہ دوپٹہ ململ کا
فالسائی رنگا ہوا ہلکا

کرتی شبنم کی آستینوں دار
ملگجے تن پہ اس کی اور بہار

نشۂ بادۂ شباب سے چور
چال مستانہ حسن پر مغرور

سینکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی
جان طاؤس و کبک لیتی ہوئی

۶۱- شوق قدوائی

۱۸۵۳-۱۹۲۸ء

شیخ احمد علی ولد کاظم علی قدوائی قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی کے باشندے ہیں۔ رشید سے مشورہ سخن کیا۔ بدایوں اور رام پور میں تعلیم پائی۔ لکھنؤ میں ایک اخبار آزاد نکالا۔ پھر پرتاپ گڑھ اور بھوپال میں ملازم ہوئے۔ رام پور میں دفتر حامد اللغات میں کام کرتے رہے۔ ڈراما قاسم و زہرا اور "مثنوی ترانۂ شوق" بہت مقبول ہوئے۔

عالمِ خیال (پہلا رُخ)

جب سے وہ جُدا ہوئے تب سے اُن کا دھیان ہے

ان سے مجھکو اُنس ہے اُن میں میری جان ہے

ساون اور یہ گھٹا میں کہیں ہوں اور وہ کہیں

حُسن یہ انھیں کا ہے اور وہ دیکھتے نہیں

زیور اب پہن چکی جی سے اب اُتر چکا

جائے بھاڑ میں سنگار دل اب اس سے بھر چکا

کس سے ناز اب کروں میرے ناز اٹھائے کون

روٹھنے کو روٹھ لوں لیکن اب منائے کون

کس سے اپنے دل کا بھید اب میں کُھل کے کہہ سکوں

اس کے ساتھ بے جھجک اب میں ہل کے رہ سکوں

مانگتی جو کوئی چیز اُس سے مُسکرا کے ہیں
ہنستے اُس کو دے کے وہ ہنستی اس کو پا کے ہیں

شاید اور کوئی شکل کھُپ گئی نگاہ میں
کوئی روک ہو گئی اِس طرف کی راہ میں

توبہ ہو کے بدگماں میں نے کی خطا ضرور
چاہے وہ کہیں رہیں ان میں ہے وفا ضرور

میں ہی خاک میں ملی گھر کی فکر خاک ہو
ان کا ذکر چھوڑ کر گھر کا ذکر خاک ہو

ذکر کیا پلنگ کا یہ ذرا سی چیز ہے
مجھ کو اپنی جان تک ان سے کب عزیز ہے

آئی ان کی سمت سے اور بو بھی لائی تو
آج او ہوا ضرور ان کو چھو کے آئی تو

ان سے مل کے آئی ہے آ تری بلائیں لوں
تو نے خوش کیا مجھے لے تجھے دُعائیں دوں

یوں نہ آئیں تو میں لوں شوق کی کشش سے کام
کھینچ کے آئیں اس طرح تو نہ لیں اِدھر کا نام

دُوسرا رُخ

خط سے پڑی جگر پہ چوٹ داغ ہرے ہوئے ہیں آج
تم سے ہزارہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہے تمھارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا ہے خط کاش وہ انگلیاں ملیں
میرا خیال چوم لے جا کے وہیں جہاں ملیں

خود بھی گئے، تم اور چین چھین کے مجھ سے لے گئے
مجھ کو سڑن بنا گئے، مجھ کو جنون دے گئے

سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے
سب کا شباب لال ہے میرا شباب زرد ہے

ایک تمھیں تھے میرا عیش بن گئے غم تو کیا کروں
پہلے تمھیں تھے میرا چین اب ہو ستم تو کیا کروں

تم نہ ستم کرو تو کیوں دل مرا بے قرار ہو
میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گناہ گار ہو

کیا میں خدا کے سامنے تم کو سزا دلاؤں گی
اپنی وفا کے نام کو خاک میں کیوں ملاؤں گی

صبر سے گزری موت پر اب تو جگر کروں گی میں
اپنے بدن کی آگ سے آپ ہی جل مروں گی میں

مجھ کو یقین ہے کہ تم آکے مجھے نہ پاؤ گے
آکے نہ پاؤ گے تو کیا میری لحد پہ آؤ گے

جان لبوں سے دے چکی تم کو پیام اور بس
سُنتی ہوں شوقؔ ہیں وہیں ان کو سلام اور بس

تیسرا رُخ

تمھارے خط کو دیکھ کر نظر اسی میں گھِر گئی
تمھاری شکل خط کے ساتھ پُتلیوں میں پھر گئی

ہے لفظ لفظ خط کا دردِ غم کی داستان سے
قلم تمھارا دل بنا وہ بول اٹھا زبان سے

وہاں جو دل میں درد ہے یہاں بھی آہ سرد ہے
وہاں جو رنگ زرد ہے یہاں بھی رُخ پہ گرد ہے

ادھر بھی چوٹ اُدھر بھی ہے نہ تاب اِدھر نہ تاب اُدھر
نہ چین ادھر نہ چین اُدھر نہ خواب ادھر نہ خواب اُدھر

وہ دن خیال ہو گئے وہ راتیں خواب ہو گئیں
وہ دو دلوں کی راحتیں سب اضطراب ہو گئیں

تمھاری عمر ہو دراز اجل کا نام چھوڑ دو
لحد کے منہ میں خاک مُنہ سے یہ کلام چھوڑ دو

یہ خط تو ختم ہو چکا پیام اب ہے شوق کا
دُعائیں اب ہیں شوق کی سلام اب ہے شوق کا

چوتھا رخ

خط کو ہے بیسواں دن آج آئیں گے وہ ضرور ہی
کیا میں کھنچی ہوئی رہوں "ان" کی نظر سے دور ہی

کیا میں جگر کو تھام لوں کیا میں نظر کو پھیر لوں
کیا "وہ" ادھر سے آئیں تو رخ میں ادھر کو پھیر لوں

"ان" کی کشش میں آ کے رخ پھر نہ سکے تو کیا کروں
دل سے کروں تو زور میں دل جو تھکے تو کیا کروں

آپ ہی بڑھ چلیں گے پاؤں آؤں گی ہٹ کے سامنے
لائیں گی شوخیاں مجھے گھونگھٹ الٹ کے سامنے

خط میں گلے میں لکھ چکی اور گلوں میں لطف ہے
ہوگی مزے کی نوک جھونک گرچہ دلوں میں لطف ہے

"وہ" مرے خط کی چٹکیاں یاد دلائیں گے مجھے
چھیڑنے کو ہنسیں گے خود اور ہنسائیں گے مجھے

اب تو یہ فکر ہے کہ آج کچھ تو سنگار چاہیے
ٹوٹ گیا ہے کل بلاق سونے کا تار چاہیے

مجھ کو بھی سادگی پسند اُن کو بھی سادگی پسند
پہنوں سپید ہی لباس ہوگا انھیں یہی پسند

ہار میں گوندھ لوں اگر پھول ہوں خانہ باغ میں
اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلا نہ باغ میں

شوق قدوائی

اے لو "حضور" آ گئے بندی سنورتی ہی رہی

بن نہ پڑا سنگار کچھ حوصلہ کرتی ہی رہی

۶۲۔ مولانا شبلیؒ نعمانی

۱۸۵۷ — ۱۹۱۴ء

قریہ بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ غازی پور میں مولانا محمد فاروق سے تعلیم حاصل کی۔ پھر رام پور اور لاہور تکمیل کی غرض سے گئے اور حجاز کا سفر کیا واپسی پر وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور وکالت شروع کی۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ گئے اور عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں قومی نظمیں لکھنی شروع کیں اور مشاہیر اسلام کے سوانح حیات مرتب کیے۔ الفاروق کی ترتیب کے سلسلے میں مصر و روم و شام کا سفر کیا اور واپسی پر سفرنامہ لکھ کر شائع کیا۔ حیدرآباد میں سررشتۂ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہو کر گئے۔ ۱۸۹۲ء میں تمغۂ مجیدی اور ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ متعدد نثر کی کتابیں اور خصوصاً سیرۃ النبیؐ کے مصنف ہیں۔ اسلامی، تاریخی نظموں کا آغاز انہی کے ہاتھوں ہوا۔ اگرچہ شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل نہیں کی۔

مذہب یا سیاست

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو   دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار

یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار

ہے یہ وہ قوتِ پُرزور کہ جس کی تکرار
سنگ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشت غبار

اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمیں
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلنے جاتے تھے ایوان گہ کسریٰ میں شکار

وہ اُلٹ دیتے تھے دُنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار

اس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

یا کوئی جاذبۂ مُلک و وطن تھا جس نے
کر دیئے دم میں قوائے عملی سب بیدار

ہے اسی مے سے یہ سرمستیِ احرارِ وطن
ہے اسی نشے سے یہ گرمیٔ ہنگامۂ کار

آپ دونوں سے کیے دیتے ہیں ہم کو محروم
نہ سیاست ہے نہ ناموسِ شریعت کا وقار

مدتوں بحثِ سیاست کی اجازت ہی نہ تھی
کہ وفاداریٔ مسلم کا تھا یہ خاص شعار

اب اجازت ہے مگر دائرۂ بحث ہے یہ
کہ گورمنٹ سے اس بات کے ہوں عرض گزار

ہم کو پامال کیے دیتے ہیں ابنائے وطن
ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقۂ اخلاص شعار

یہ بھی اک گونہ شکایت ہے غلاموں کو ضرور
کہ مناصب میں ہے کم حلقہ بگوشوں کا شمار

اب رہا جذبۂ دینی تو وہ اس طرح مٹا
کہ ہمیں آپ ہی آتا ہے اب اس نام سے عار

وضع میں طرز میں اخلاق میں سیرت میں کہیں
نظر آتے نہیں کچھ حرمتِ دیں کے آثار

آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار

بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا
کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار

ہم نے پہلے بھی تو اغیار کے سیکھے تھے علوم
ہم نے پہلے بھی تو اس نشہ کا دیکھا تھا خمار

نام لیتے تھے ارسطو کا ادب سے ہر چند
تھے فلاطون الٰہی کے بھی تو شکر گزار

جانتے تھے مگر اس بات کو بھی اہلِ نظر
کہ حریفوں کو نہیں انجمنِ خاص میں بار

یعنی یہ بادۂ عرفاں کے نہیں ذوق شناس
بزمِ اسرار کے یہ لوگ نہیں بادہ گسار

آج ہر بات میں ہے شانِ تفرنج پیدا
آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار

ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود
کہ جہاں تک انھیں معقول بتائیں اغیار

۶۳- بےخود دہلوی

۱۸۶۲-۱۹۵۵ء

سیّد وحید الدین ولد سیّد شمس الدین احمد بھرت پور میں پیدا ہوئے اور دِلّی میں نشو و نما پائی۔ حاؔلی کے شاگرد تھے۔ اور بعد کو داؔغ سے استفادہ کیا۔ عنفوانِ شباب سے شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ شکار، شہسواری اور تیغ رانی سے بھی دل چسپی تھی۔ دِلّی کے انگریز افسروں کو اردو اور فارسی کی تعلیم دیتے رہے۔ اکثر رام پور میں بھی قیام رہا۔ کلام کے مجموعے گفتارِ بیخودی ۱۳۲۳ھ اور درِ شہوار ۱۳۳۸ھ میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

اُٹھے تری محفل سے تو کس کام کے اُٹھے
دل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اُٹھے

دم بھر مرے پہلو میں انھیں چین کہاں ہے
بیٹھے کہ بہانے سے کسی کام کے اُٹھے

افسوس سے اغیار نے کیا کیا نہ ملے ہاتھ
وہ بزم سے جب ہاتھ مرا تھام کے اُٹھے

دُنیا میں کسی نے بھی یہ دیکھی نہ نزاکت
ان سے نہ کبھی حرف مرے نام کے اُٹھے

جو ظلم و ستم تم نے کئے سب وہ اُٹھائے
اِک رنج و الم ہم سے نہ الزام کے اُٹھے

صدمے تو بہت قید میں جھیلے مرے دل نے
جھٹکے نہ مگر زلفِ سیہ فام کے اُٹھے

ہے رشک کہ یہ بھی کہیں شیدا نہ ہوں اس کے
تربت سے بہت لوگ مرے نام کے اُٹھے

افسانۂ حسن اس کا ہے ہر ایک زباں پر
پردے نہ کبھی جس کے در و بام کے اُٹھے

آغازِ محبت میں مزے دل نے اُٹھائے
پوچھے تو کوئی رنج بھی انجام کے اُٹھے

دل نذر میں دے آئے ہم اس شوخ کو بیخودؔ
بازار میں جب دام نہ اس جام کے اُٹھے

بلایا موت کو برسوں میں التجا کر کے
خدا کے پاس چلا ہوں خدا خدا کر کے

حجاب آ ہی گیا ہم کو التجا کر کے
درِ قبول سے ہٹ آئے ہم دُعا کر کے

ہمیں تو رنج نہ ہو جان بھی فدا کر کے
ذرا سا مُنہ نکل آیا ترا جفا کر کے

خیالِ یار میں مرنا وصال سمجھا ہوں
زبان بند ہوئی وصل کی دُعا کر کے

ادا ہے شرط بناوٹ بھی لطف دیتی ہے
وہ خود بھی روٹھ گئے ہیں مجھے خفا کر کے

ملی ہے دولتِ دیدار دل کے صدقے میں
رہیں گے آج تو ہم جان بھی فدا کر کے

عطا ہو یا نہ ہو کچھ ہم کو اس سے کیا مطلب
غرور ہم کو مٹاتا ہے التجا کر کے

زباں پہ رہتی ہے ہر وقت توبہ استغفار
پھرے ہیں کعبے سے اے شیخ آپ کیا کر کے

رہوں گا شکر کے سجدے میں حشر تک مصروف
کہ وہ نواز گئے سر مرا جدا کر کے

کرم کیا کبھی مجھ پر تو جل گئے دشمن
بُرا بنا کوئی سب میں مرا بھلا کر کے

غرورِ کبر نے آخر گناہ گار کیا
ڈبو دیا مجھے مشہور پارسا کر کے

عذاب کہتے ہیں جس کو ہوس ہے دُنیا کی
بلا ہے چین یہاں ترکِ مدعا کر کے

کہیں نہ عشق کے دفتر سے نام کٹ جائے
زبان کاٹ رہا ہوں ترا گلا کر کے

وظیفہ خوانیِ بےخود کا راز سمجھے بھی   بُتوں سے ربط بڑھایا خدا خدا کرکے

۶۴۔ صفؔی لکھنوی

۱۸۶۲ - ۱۹۵۰ء

سیّد علی نقی صفیؔ ولد سیّد فضل حسین لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی۔ اور انگریزی پڑھانے پر مامور ہوگئے۔ سلطان پور رائے بریلی وغیرہ مقامات پر مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن حاصل کی۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انجمن بہار ادب کے صدر تھے۔ قومی نظموں کے اعتراف میں عوام نے لسان القوم کا لقب دیا اور کئی بار طلائی تمغے پیش کیے۔

طلبِ دید پہ آنچ آئے یہ منظور نہیں   دل میں ہے ورنہ وہ بجلی جو سرِ طور نہیں

دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بھی کچھ دور نہیں   مگر اس پر بھی ملاقات انھیں منظور نہیں

ہم کو پروانہ و بلبل کی رقابت سے غرض   گل میں وہ رنگ نہیں شمع میں وہ نور نہیں

خلوتِ دل نہ سہی کوچہ، شہ رگ ہی سہی   پاس رہ کر نہ سہی آپ سے کچھ دور نہیں

ذوق پابندِ وفا کیوں رہے محرومِ جفا   عشق مجبور سہی حسن تو مجبور نہیں

تابشِ حسن نے جب ڈال دیئے ہوں پردے   ممکن آنکھوں سے علاجِ دلِ رنجور نہیں

لاؤ میخانے ہی میں کاٹ نہ دیں اتنی رات   مسجدیں ہو گئیں معمور یہ معمور نہیں

چھیڑ دے سازِ انا الحق جو دوبارہ سر دار   بزمِ رنداں میں اب ایسا کوئی منصور نہیں

کبھی کیسے ہو صفیؔ پوچھ تو لیتا کوئی
دل وہی کا مگر اس شہر میں دستور نہیں

تڑپ کے رات بسر کی جو اک مہم سر کی
چھری تھی میرے لئے جو شکن تھی بستر کی

عرق عرق ہیں جو گرمی سے روزِ محشر کی
پناہ ڈھونڈتے ہیں میرے دامنِ تر کی

ہوا گمان اسی شوخ سست پیماں کا
اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی

اسی طرف ترے قرباں نگاہِ شرم آلود
مجھی پہ تیز ہو یہ باڑھ کُند خنجر کی

خرام وہ جو ہلا دے جگر فرشتوں کا
نگاہ وہ جو اُلٹ دے صفوں کو محشر کی

سجائی حضرتِ واعظ نے کس تکلف سے
متاعِ زہد و ورع سیڑھیوں پہ منبر کی

عبورِ بحرِ حقیقت سے جب نہیں ممکن
کنارے بیٹھ کے لہریں گنوں سمندر کی

سُنے گا کون سُنی جائے گی صفیؔ کس سے
تمھاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

۶۵۔ ثاقبؔ لکھنوی

۱۸۶۹-۱۹۵۴ء

میر ذاکر حسین ثاقبؔ آگرے میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں پرورش پائی۔ آگرے میں میر مومن صفیؔ کی مجالس سے ذوق شعر گوئی شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ مشہور ہو گئے۔ ریاست محمود آباد میں عرصے تک خدمت کی اور وہیں سے وظیفہ ملتا رہا۔ غالبؔ کے تخیّل اور میرؔ کی زبان کی تقلید میں کامیاب ہوئے۔ قدیم لکھنوی رنگ سے دور رہنے کی کوشش کی۔

وہی ذاتِ باری کو پہچانتا ہے
جو اپنی حقیقت کو خود جانتا ہے

اُٹھاتا ہے دل ذِلتیں ذِلتوں پر — مگر میرا کہنا نہیں مانتا ہے
طریق نیاز اور طرزِ تغافل — یہ میں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے
مشیّت وہاں ہے بعنوانِ دیگر — یہاں اور کچھ دل میں تو ٹھانتا ہے
ستم گر مری چُپ سے راضی ہے ورنہ — گِلہ کیجیے تو بُرا مانتا ہے
بَری ہوں میں لوثِ گنہ سے مگر دل — مجھے آپ کردار میں سانتا ہے
اِدھر سر نگوں میں اُدھر میرا قاتل — پئے قتل دامن کو گردانتا ہے
صفائی کہاں خاک دانِ جہاں میں — وہ سب کر کرا ہے جو تو چھانتا ہے
غنیمت ہے ثاقبؔ کا دم لکھنؤ میں — وہ جو کچھ بُرا یا بھلا جانتا ہے

عشق مظلوم بے خطا نہ ہوا — حُسن اچھوں میں بھی بُرا نہ ہوا
سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر — کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا
ہنس کے بھی رو کے بھی کہا لیکن — مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا
بستر اٹھا نہ کوئے قاتل سے — شکر ہے پاس بوریا نہ ہوا
آشنا تھا مذاقِ عشق سے دِل — تلخ کامی سے بے مزا نہ ہوا

کہاں تک جفا حُسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ — گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ — کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

۶۶۔ نوح ناروی

۱۸۷۹ء

محمد نوح نارہ ضلع الہ آباد وطن ہے۔ بھوانی پور ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ پہلے جلال لکھنوی سے اور آخر میں داغ دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ حیدرآباد بھی گئے تھے۔ داغ ہی کے رنگ میں لکھتے تھے اور ان کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ کلام کے مجموعے سفینۂ نوح۔ طوفانِ نوح اور اعجازِ نوح شایع ہوئے۔

دل ہماری طرف سے صاف کرو
جو ہوا سو ہوا معاف کرو

مجھ سے کہتی ہے اس کی شان کرم
تم گناہوں کا اعتراف کرو

حسن ان کو یہ رائے دیتا ہے
کام اُمید کے خلاف کرو

حضرتِ دل یہی ہے دیر و حرم
خانۂ یار کا طواف کرو

طور سینا کی سمت جائیں کلیم
نوح تم سیر کوہِ قاف کرو

تاب نہیں سکوں نہیں دل نہیں اب جگر نہیں
اپنی نظر کدھر اُٹھے کوئی اِدھر اُدھر نہیں

روز و شب اُٹھتے بیٹھتے ان کی زبان پر نہیں
کوئی نہیں کی حد نہیں شام نہیں سحر نہیں

کوئی یہاں سے چل دیا رونق بام و در نہیں
دیکھ رہا ہوں گھر کو میں گھر ہے مگر وہ گھر نہیں

اتنی خبر تو ہے ضرور لے گئے دل وہ چھین کر
کیا ہوا اس کا پھر مآل اس کی مجھے خبر نہیں

کیوں وہ اِدھر اُدھر پھرے کیوں یہ حدود میں رہے
تیری نظر تو ہے نظر میری نظر نظر نہیں

مجھ سے بگڑ کر اپنے گھر جایئے خیر جایئے
آپ نے یہ سمجھ لیا آہ میں کچھ اثر نہیں

دَیر کو ہم گھٹائیں کیوں کعبے کو ہم بڑھائیں کیوں
کیا ہے خدا کا گھر یہی کیا وہ خدا کا گھر نہیں

پردے سے باہر آیئے رُخ سے نقاب اُٹھایئے
تابِ جمال لا سکے اتنی مری نظر نہیں

مجھ کو خیال رُوز و شب خاک رہے مزار میں
ایسی جگہ ہوں جس جگہ شام نہیں سحر نہیں

تیغ کہو سناں کہو قہر کہو بلا کہو
اہلِ نظر کی رائے میں ان کی نظر نظر نہیں

ڈر گئے اہلِ انجمن تیر جو آپ کا چلا
اِس نے کہا اِدھر نہیں اُس نے کہا اُدھر نہیں

روز کے غم نے اس طرح خوگرِ ضبطِ غم کیا
درد ہمارے دل میں ہے شکوہ زبان پر نہیں

پوچھتے ہیں وہ حالِ دل طولِ سخن سے فائدہ
سو کی یہ ایک بات ہے کہہ دوں مجھے خبر نہیں

ان میں کچھ اور بات تھی ان میں کچھ اور بات ہے
حضرتِ نوحؑ کا گماں حضرتِ نوحؑ پر نہیں

۶۷۔ سیمابؔ اکبر آبادی

۱۸۸۰۔۱۹۵۲ء

عاشق حسین ولد محمد حسین آگرے میں پیدا ہوئے، ایف اے تک تعلیم پائی تھی کہ والد کی وفات کے باعث ۱۸۹۷ء میں تعلیم چھوڑنی پڑی۔ شاعری کا ذوق فطری ہے۔ امتحان کے پرچوں میں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کرتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں داغؔ کے شاگرد ہوئے، وارث علی شاہ صاحب سے بیعت کی۔ شاعری میں بلند خیالات اور انسانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کانپور میں کچھ عرصے ملازم رہے۔ بعد میں استعفا دے کر آگرے میں اپنا قصر الادب قائم کیا۔ سیکڑوں نوجوان ان کے شاگرد ہوئے۔ کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ مثلاً کارِ امروز۔ حکیم عجم۔ نیستاں۔ پیامِ فردا۔ تورات مشرق۔ آیات الادب۔ سرودِ غم۔ پیغامات وغیرہ۔

میں تنہا آب و رنگِ بزمِ امکاں ہو نہیں سکتا
یہ دل واپس اگر تو اِس میں مہماں ہو نہیں سکتا

نہ گھبرا بھید اگر اس کا نمایاں ہو نہیں سکتا
ارے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا

یہاں ہر چیز میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کل کی
وہ ذرّہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

معاذ اللہ کمالِ علمِ ہستی کی یہ غایت ہے
کہ انساں واقفِ انجامِ انساں ہو نہیں سکتا

مجھے حیراں نہ کر ہاں میری صورت سے عیاں ہو جا
میں آئینہ تو بن سکتا ہوں حیراں ہو نہیں سکتا

نہیں اِک لفظ ایسا دفترِ کونین میں کوئی
جو میری داستانِ دل کا عنواں ہو نہیں سکتا

اُلٹ دے دل کو بھی جب دل کے پردے سب اُلٹ جائیں
اسے بھی کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا

شکستہ عالمِ گل ہے تو ہو گی بارشِ گل بھی
وہ ہو مایوس جو خاکِ گلستاں ہو نہیں سکتا

وہاں لائی ہے حرصِ آدمیت منفعل کرنے
جہاں صدیوں میں پیدا ایک انساں ہو نہیں سکتا

امیدیں کچھ محبّت کی ہیں کچھ ہیں حسن کے وعدے
ابھی شیرازۂ عالم پریشاں ہو نہیں سکتا

محبت کی بلند انجامیوں کا کیا ٹھکانا ہے
فرشتہ بھی شریکِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا
نمودِ گُل سے خاکِ گُل تک اک دُنیا بدلتی ہے
شمارِ انقلاباتِ گلستاں ہو نہیں سکتا

مذاقِ ضبط و قیدِ جبر سے مجبور ہوں اتنا
کہ باوصفِ پریشانی پریشاں ہو نہیں سکتا
سُنا اے چُپکے چُپکے دل کے پردے کھینچنے والے
تری حدِّ خودی تک وہ نمایاں ہو نہیں سکتا

خدا اور ناخدا مل کر ڈبو دیں یہ تو ممکن ہے
مری وجہِ تباہی صرف طوفاں ہو نہیں سکتا
دعا جائز خدا برحق مگر مانگوں تو کیا مانگوں
سمجھتا ہوں کہ میں دُنیا بداماں ہو نہیں سکتا

جوانی بھی گئی سیمابؔ فصلِ گل فشانی بھی
میں اب تا دیر محفل میں غزلخواں ہو نہیں سکتا

۶۸۔ مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

۱۸۸۲-۱۹۳۵ء

مرزا محمد علی کے فرزند لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ علم دوست خاندان سے تعلق تھا۔ جدید رجحانات سخن سے زیادہ لکھنؤ کے قدیم رنگ تغزل پر زور دیتے تھے۔ قصیدہ نگاری میں سوداؔ اور ذوقؔ کے قریب پہنچ گئے تھے اور

غزل میں میر و غالب کے ہم پلّہ۔ غالب کی طرح ان کے اشعار پر بھی بعید از فہم ہونے کا اعتراض کیا گیا۔ ان کا دیوان "گل کدہ"، اور مجموعۂ قصائد "صحیفۂ ولا" شایع ہو چکے ہیں۔ قصیدے تمام تر رسول اکرم اور اہلِ بیت کی شان میں لکھے ہیں۔

سوزِ غم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا
آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا

تھی رگِ برقِ جہندہ نبضِ بیمارِ فراق
دیکھتے ہی دیکھتے دستِ مسیحا جل گیا

دیکھ کر برقِ تجلّی اُڑ گئے موسیٰ کے ہوش
جلوہ گاہِ ناز کا جس وقت پردا جل گیا

کیا مٹایا قلبِ خوں گشتہ کو آہِ گرم نے
اس قدر اٹھا بخار آخر کہ دریا جل گیا

ہر بُنِ مُو سے نکلتا ہے دھواں تاچند ضبط
جل گیا اے سوزِ پنہاں میں سراپا جل گیا

آگ تو دل کی بجھا لینے دو پھر کچھ پوچھنا
ہوش کس کو کیا بتائے کیا رہا کیا جل گیا

داغِ الفت میں لگا دی آگ سب دل میں عزیزؔ
ایک چنگاری سے سارا گھر ہمارا جل گیا

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں
اِدھر آؤ تم کو گلے سے لگا لیں

بھلا ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے
کہاں تک طبیعت کو اپنی سنبھالیں

یہ مانا کہ آزردہ تم سے ہمیں تھے
مگر آؤ اب ہم تمھیں کو منا لیں

کہو بزمِ جمشید کے ساقیوں سے
فقیرِ درِ میکدہ کی دُعا لیں

عزیزؔ اپنا زخمِ جگر تو دکھا دیں
مگر دونوں ہاتھوں سے وہ دل سنبھالیں

۶۹۔ لبھو رام جوشؔ ملسیانی

۱۸۸۲ء

ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ داغؔ سے اصلاح لی مختلف سرکاری مدرسوں میں فارسی کے مدرس رہے۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت سے وظیفہ لیا۔ کلام کے مجموعے 'بادۂ سرجوش' اور 'جنونِ ہوش' شایع ہو چکے ہیں۔ وطن ہی میں رہتے ہیں۔

ہے کہ نہیں

پوچھتا ہوں کہ تمھیں پاسِ وفا ہے کہ نہیں
کچھ کہو بھی جو کہا میں نے سُنا ہے کہ نہیں

دَیر سے کعبے کو جاتا ہوں یہ مقصد لے کر
دیکھ تو لوں کہیں میرا بھی خدا ہے کہ نہیں

کہہ چکا قصّۂ غم ان سے تو پوچھا میں نے
ایک دُکھے ہوئے دل کی یہ صدا ہے کہ نہیں

آپ نے اور سزاؤں سے تو انکار کیا
بے رُخی میری محبّت کی سزا ہے کہ نہیں

اے صبا تو نے چمن کی تو سُنائی روداد
آشیانے کا بھی کچھ حال بتا ہے کہ نہیں

اس زمانے میں تو رہزن ہی سے پوچھو یہ بات
بھولے بھٹکے کا کوئی راہ نما ہے کہ نہیں

تھک گئے ڈھونڈ کے انصاف کو سب فریادی
جس سے پوچھا ہے کہی اس نے کہا ہے کہ نہیں

خوفِ دُنیا کا تو ہوگا مجھے کیا اس سے غرض
میں تو یہ پوچھتا ہوں خوفِ خدا ہے کہ نہیں

چارہ گر ایک نیا روگ ہوا جاتا ہے
اس مرض کی بھی کتابوں میں دوا ہے کہ نہیں

میرے احباب بھی اب پوچھ رہے ہیں مجھ سے
تجھ کو انعامِ محبّت کا صلا ہے کہ نہیں

غم دیئے رنج دیئے تم کو خدا نے اے جوشؔ
پھر بھی یہ پوچھ رہے ہو کہ خدا ہے کہ نہیں

ترا دیوانہ

صبوحی کش ہوائے ساغر و مینا میں رہتا ہے
فرشتہ نور بن کر عالمِ بالا میں رہتا ہے
کوئی دوزخ میں کوئی جنّت الماویٰ میں رہتا ہے
نہ گلشن ہی میں رہتا ہے نہ وہ صحرا میں رہتا ہے

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

نظر کے سامنے جو کچھ ہے اس کو ماسوا سمجھے
حرم کو بتکدے کو وہ کسی کا نقشِ پا سمجھے
جسے ہم انتہا کہتے ہیں اس کو ابتدا سمجھے
کوئی یہ بھید کیا جانے کوئی یہ راز کیا سمجھے

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

کبھی روتے ہوئے ہنگامۂ پُر جوش ہو جانا
کبھی سازِ شکستہ کی طرح خاموش ہو جانا
کبھی بیگانۂ صورت سے بھی ہم آغوش ہو جانا
کبھی اپنی نظر سے آپ ہی روپوش ہو جانا

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ خندہ زن ہی عقل و حکمت پر جنوں اس کا
کوئی خم خانۂ معنیٰ ہی جامِ واژگوں اس کا
زمانے بھر میں ہلچل ڈالنے والا سکوں اس کا
لگا دے آگ ہفت افلاک میں سوزِ دروں اس کا

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

چمن کو شہر کو بستی کو ویرانہ سمجھ لینا
بیانِ جنّت و دوزخ کو افسانہ سمجھ لینا
خوشی کی عیش کی محفل کو غم خانہ سمجھ لینا
خرد سے ہوش سے دُنیا کو بیگانہ سمجھ لینا

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ اس کی چشمِ تر کے آنسو مسکراتے ہیں
ہمیشہ اس کے نالے نغمۂ شیریں سُناتے ہیں

ہمیشہ اِس کے تقویٰ کی قسم میخوار کھاتے ہیں ہمیشہ اس کی پُرنوشی سے تائب فیض پاتے ہیں

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

جہانِ رنگ و بو کو دخل کیا اس کی طبیعت میں جگہ پاتی نہیں جنت بھی اس کے باغ فطرت میں

نیا سودا نئی شورش ہے اس کے جوشِ الفت میں وہ اس دنیا کی حسرت میں نہ اس دُنیا کی حسرت میں

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

۷۰۔ امین حزیں

۱۸۸۴ء - ۱۹۶۸ء

خواجہ محمد مسیح پال ولد احمد دین سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شمس العلما مولوی امیر حسن سے عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ انڈین پولیٹیکل ایجنسی گلگت خان بہادر کا خطاب ملا اور پنشن پائی۔ دورانِ ملازمت میں بھی شعر و سخن کا شغل جاری رہا۔ ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر اور اقبال سے متاثر ہوئے۔ ان کے کلام کا مجموعہ گلبانگِ حیات، شایع ہو چکا ہے۔

افسانۂ حیات کو دُہرا رہا ہوں میں یوں اپنی عمرِ رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں

اِک اِک قدم پہ درسِ وفا دے رہا ہوں میں یہ کس کی جستجو ہے کدھر جا رہا ہوں میں

یارب کسی کا دامِ حسیں منتظر نہ ہو پر شوق کے لگے ہیں اُڑا جا رہا ہوں میں

اِس سحرِ رنگ و بو نے تو دیوانہ کر دیا دامن کے تار تار کو اُلجھا رہا ہوں میں

سوزِ درونِ سینہ کو نغموں میں ڈھال کر سازِ نفس کے تار کو برما رہا ہوں میں

راہِ طلب میں دیکھ مرے دل کی حسرتیں
سایے میں پائے خضر کو سہلا رہا ہوں میں

رستے کے اونچ نیچ سے واقف تو ہوں امینؔ
ٹھوکر قدم قدم پہ مگر کھا رہا ہوں میں

ناز ہی کیا نیاز مندوں کا
بندگی ہے شعار بندوں کا

جس طرح سے خمار کا ہے علاج
درد درماں ہے دردمندوں کا

ہر حسیں چیز کا ہوں گرویدہ
کیا ہی کہنا مری پسندوں کا

زندگی میں فراغ ناممکن
زندگی سلسلہ ہے دھندوں کا

دل کی خودداریوں کی خیر نہیں
دَور دَورہ ہے خودپسندوں کا

بلبلو باغ میں تمھیں ہو ہدف
غنچہ و گل کے زِشت خندوں کا

بوالہوس کی امینؔ بلا جانے
عشق مسلک ہے دردمندوں کا

۷۱ - اثرؔ لکھنوی

۱۸۸۵ء - ۱۹۶۷ء

میرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ شاہی اطبا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں بی۔اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں یو پی کی پراونشل سروس میں بطور ڈپٹی کلکٹر داخل ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں کلکٹر ہوئے۔ بعد کو الہ آباد اور کشمیر میں بھی عہدوں پر سرفراز ہوئے۔

میرزا ہادی عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ملازمت کے دوران میں بھی شعر و سخن کا مشغلہ جاری رہا۔ زبان اور جذبات دونوں کی خوبی ان کے

کلام میں موجود ہے۔ ان کے مجموعے اثرستان ۱۹۲۴ء اور بہاراں ۱۹۳۹ء
میں شایع ہو چکے ہیں۔

کوئی اس طرح ساون گا رہا ہے | دلِ ناشاد اُمڈا آ رہا ہے
سُروں میں ڈوبا لہرا بانسری کا | قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے
ٹھو کے دے رہی ہیں بھیگی تانیں | کلیجا مُنہ کو پیہم آ رہا ہے
پپیہا ٹیرتا ہے کہہ کے "پیو پیو" | یہ پاپی اور بھی تڑپا رہا ہے
ادھر آواز میں لگتی ہے پتی | ادھر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
بھری برسات اور یہ گھپ اندھیرا | اندھیرا آپ سر ٹکرا رہا ہے
کسی کو تیل میں جیسے ڈبوؤ | یونہیں سینے میں دم گھبرا رہا ہے
اندھیری رات میں کوندا لپک کر | دبی جو آگ تھی بھڑکا رہا ہے
ادھر جھنکارتے ہیں مور ادھر دل | پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھا رہا ہے
چمکتے اب نہیں جگنو ہوا میں | فلک چنگاریاں برسا رہا ہے
مسلسل نغمہ بھی جھینگر کی جھنکار | دلِ اب آزار جس سے پا رہا ہے
سہاگن رات کا جلتا ہے کاجل | مرا اک اِک رُواں تھرّا رہا ہے

یہ رات اور یاد اثرؔ اِک بے وفا کی
بس اب رہنے دو رونا آ رہا ہے

اپنی وفا نہ ان کی جفاؤں کا ہوش تھا | کیا دن تھے جب کہ دل میں محبت کا جوش تھا
صورت بھی دیکھے اور تری باتیں بھی سُن سکے | گُل چشمِ شوق بن کے طلب گار گوش تھا

ہر جلوہ ایک پردہ تھا ہر دل تھا اک حجاب — بیگانگی کا بزمِ تمنا میں جوش تھا
سازِ حیات بند تھا دم تھمے رُکے ہوئے — اس جلوہ گاہِ ناز میں جو تھا خموش تھا
ناکامیوں کی باغِ تمنا میں تھی بہار — گل ریز داغِ دل تھے جگر گل فروش تھا
دونوں کو اک نگاہ پہ قربان کر دیا — دل جان کا عذاب تھا سر بار دوش تھا
کی صرف ہم نے عمر سمجھنے میں رازِ عشق — طاعت گزار ہوتے کہاں اتنا ہوش تھا

۷۲۔ سیّد احمد حسین امجدؔ

۱۸۸۷ء

۱۸۸۷ء میں بمقام حیدر آباد پیدا ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل امتحان کامیاب کیا۔ مدرسہ دار العلوم اور دفتر صدر محاسبی میں ملازمت کی اور بحیثیت مددگار صدر محاسب وظیفہ حسن خدمت لیا۔ گزشتہ نصف صدی سے بحیثیت شاعر اور عہدِ حاضر کے سب سے بڑے رُباعی گو مشہور ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی نے حکیم الشعرا لقب مشہور کیا۔ رباعیوں کے کئی مجموعے اور نثر کی کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ جن میں جمالِ امجدؔ، گلستانِ امجدؔ، حجِ امجدؔ، پیامِ امجدؔ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو نے ان کی طلائی جوبلی منائی تھی۔ تصوف و عرفان میں بھی خاص دخل ہے۔ اور حیدر آباد کے اکثر اہلِ علم و فضل ان کے معتقد ہیں۔

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے — مضمون بلند لامکاں سے لائے

ہر شعر بہ اعتبار فن خوب کہا لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

میاں امجد تمھاری جیسی مرضی ہو کافر کہ تم اسلام لاؤ
مگر کہہ دیتے ہیں اک کام کی بات جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا مجھے کس نے بنایا کیوں بنایا
عدم میں کس مزے سے سو رہا تھا مجھے کس نے جگایا کیوں جگایا
بہت دور ایک کونے میں پڑا تھا یہاں کس نے بلایا کیوں بلایا
پھر آخر اس بھری محفل سے امجد مجھے کس نے اٹھایا کیوں اٹھایا

برباد نہ کر بے کس کا چمن بے درد خزاں سے کون کہے
تاراج نہ کر میرا خرمن اس برقِ تپاں سے کون کہے
مجھ خستہ جگر کی جان نہ لے یہ کون اجل کو سمجھائے
کچھ دیر ٹھہر جا اے دریا دریائے رواں سے کون کہے
ہر چند ہماری حالت پر رحم آتا ہے ہر اک کو لیکن
کون آپ کو آفت میں ڈالے اس آفتِ جاں سے کون کہے
ہر چند بہت غم ہیں پنہاں اور دل میں ہزاروں ہیں ارماں
اس برقِ مجسم کے آگے حال اپنا زباں سے کون کہے
قاصد کے بیاں کا اے امجد کیوں کر ہو اثر ان کے دل پر
جس درد سے تم خود کہتے ہو اس طرزِ بیاں سے کون کہے

۷۳۔ تلوک چند محرومؔ

۱۸۸۷ء

بھگت رام دیال کے فرزند دریائے سندھ کے مغربی کنارے تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ پھر بنوں جاکر وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول سے ۱۹۰۷ء میں انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ ایف اے اور بی اے کے امتحان بعد میں ملازمت کے دوران میں پاس کیے۔ ۱۹۰۸ء میں مشن ہائی اسکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں مدرس مقرر ہوئے۔ اور عمر بھر محکمۂ تعلیم ہی میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کارڈن کالج راولپنڈی میں اردو و فارسی کے لکچرر رہے اور ۱۹۴۸ء سے اب تک پنجاب یونی ورسٹی کیمپ کالج دہلی میں اردو کے لکچرر ہیں۔ دلی میں ایک سال تک اخبار تیج ہفتہ وار کے مدیر بھی رہے۔ بچپن سے شعر و سخن کا ذوق ہے۔ مخزن اور زمانہ میں ابتدائی کلام چھپا۔ حسب ذیل کلام کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ کلام محرومؔ تین حصے۔ رباعیاتِ محرومؔ۔ گنجِ معانی۔ مہرشی درشن۔ گنج معانی کا مقدمہ سر شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا جس میں محرومؔ کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔ پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔

ہم دل جلوں کو اے بُتِ نامہرباں نہ چھیڑ ۔۔۔ بھڑکے گا اور شعلۂ سوزِ نہاں نہ چھیڑ

صیّاد اور خزاں کے ستم اس پہ کم نہیں
تو عندلیب زار کو اے باغباں نہ چھیڑ

ہے ہے کسی کی بزم مجھے یاد آگئی
واعظ خدا کے واسطے ذکرِ جناں نہ چھیڑ

دُنیا میں اے زباں روشِ صلح کل نہ چھوڑ
جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ

ہمدم کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے
ایّام حُسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا
محرومؔ پھر فسانۂ زلفِ بُتاں نہ چھیڑ

نظر اُٹھا دلِ ناداں یہ جُستجو کیا ہے
اسی کا جلوہ تو ہے اور رُوبرو کیا ہے

کِسی کی ایک نظر نے بتا دیا مجھ کو
سرُور بادۂ بے ساغر و سبو کیا ہے

قفس عذاب سہی بُلبُلِ اسیر مگر
ذرا یہ سوچ کہ وہ دام رنگ و بو کیا ہے

نہ میرے اشک میں شامل نہ ان کے دامن پر
میں کیا بتاؤں انھیں خونِ آرزو کیا ہے

سخن ہو سمع خراشی تو خامشی بہتر
اثر کرے جو نہ دل میں وہ گفتگو کیا ہے

بُرا تو کہتے ہو محرومؔ شاعری کو مگر
نہ ہو یہ چیز تو حضرت کی آبرو کیا ہے

گھبرائیے کیوں زندگی بے کیف اگر ہے
آخر شبِ تاریک کا انجام سحر ہے

وہ شام کی صورت ہے نہ وہ رنگِ سحر ہے
کس کوکبِ منحوس کا یارب یہ اثر ہے

افسانۂ غم سینۂ بلبل میں ہے فریاد
اوراقِ گلِ تر میں بہ عنوانِ دگر ہے

بے درد ہے انسان تو ہیں اس کے ہُنر عیب
ہے دل میں اگر درد تو ہر عیب ہُنر ہے

ثابت ہے بہرِ طور غمِ عشق رمِ حُسن
آرام کو پوچھو تو ادھر ہے نہ ادھر ہے

مصنوع کو صانع سے جدا کر نہیں سکتے ۔۔۔ آئینے میں عکسِ ہنر آئینہ گر ہے
روتی ہوئی آنکھوں میں غرقابِ تبسم ۔۔۔ پنجاب ہے دہلی میں جو اب راہ گزر ہے
پھولوں میں ترا رنگ ہے کانٹوں میں تری نوک ۔۔۔ یہ حسن ترا ہے کہ مرا حسنِ نظر ہے

محروم مگر عشق تمھارا ہے ریائی
فریاد میں تاثیر نہ آہوں میں اثر ہے

علّامہ اقبال کی موت پر

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا ۔۔۔ احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا
کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر ۔۔۔ قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا ۔۔۔ ویرانہ فنا سے سلامت گزر گیا
باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا ۔۔۔ باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں ۔۔۔ خورشید جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا
"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق" ۔۔۔ روشن ترا اس حقیقتِ روشن کو کر گیا

محروم کیوں ترے حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

۷۴۔ جگت موہن لال رواںؔ

۱۸۸۹-۱۹۳۴ء

جگت موہن لال موراواں ضلع اُنّاؤ کے رہنے والے تھے۔

۱۹۱۴ء میں ایم اے ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ اور وکالت کرنے لگے۔ مولانا احسن مارہروی کے معتقد اور فطری شاعر تھے۔ سوز و گداز اور روانی ان کے کلام کی خصوصیتیں ہیں۔ رُباعیاں اور غزلیں بڑی عمدہ لکھیں۔ مجموعۂ کلام روحِ رواں کے نام سے چھپ چکا ہے۔

شاعری

مرحبا مشاطۂ زلفِ مضامینِ بلند — رہبرِ راہِ خدا ہادیِ جانِ دردمند
رازدارِ ضبطِ دل اے پردہ دارِ رازِ نفس — کاشفِ اسرارِ باطن عکسِ سوز و سازِ نفس
اے بہارِ بے خزاں اے آفتابِ لازوال — کر نہیں سکتا تجھے جورِ زمانہ پائمال
اے نشانِ رفتگاں اے رنگِ خونابِ جگر — نورِ قلبِ باصفا تعبیرِ جذبِ پُر اثر
جس پہ سو جاں سے ہو دل صدقے ترا وہ ناز ہے — جس نے عالم کو کیا بسمل ترا انداز ہے
اے انیسِ گوشۂ عزلت گزینانِ الم — اے شریکِ حالِ زار صاحبانِ درد و غم
اے زبانِ غیب اے نیچر کی سچی ترجماں — نیّرِ افلاکِ شہرت یادگارِ جاوداں
کب تری معراج کے ہم سر ہے معراجِ شہی — تیرے قدموں پر نچھاور سیکڑوں تاجِ شہی

لاوارث بچّہ

آہ اے نو واردِ بزمِ رباطِ روزگار — آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار
آہ اے دیباچۂ شرحِ کتابِ دردِ دل — آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جاں گسل

آہ اے تعبیرِ خوابِ مستِ ایّامِ شباب
آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب
آہ اے زنجیرِ پائے نازکِ وہم و گماں
آہ اے تصویرِ احساسات و جذبات نہاں

سچ بتا تجھ پہ ترا وارث ترا والی ہے کون
پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون
زینتِ آغوش ہے تو جس کا وہ مادر ہے کون
نور ہے جس گھر کا تو مجھ کو بتا وہ گھر ہے کون
اختصارِ طول آزارِ نہانی سچ بتا
اے خمارِ بادۂ جوشِ جوانی سچ بتا

کیا اُڑا لائی کسی گلزار سے تجھ کو ہوا
پھول ہوتے ہیں جہاں ایسے ہی پیدا خوشنما
یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اس قدر
خود مرکّب ہو گئے اور بن گئے شکلِ بشر

تو کوئی اسرارِ پنہانی کا دفتر تو نہیں
تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں
آہ یہ تیری ادا حسنِ تحیّر زا ترا
رو کشِ لطفِ تبسّم آہ یہ رونا ترا

یوں نہ کرتی ورنہ ماں اپنا فشارِ آرزو
یوں بناتی خود نہ ماں اپنا مزارِ آرزو
حسن کا برباد ہو جانا ہمیں بھاتا نہیں
میرے مولا یہ سمجھ میں راز کچھ آتا نہیں

۷۵۔ جگرؔ مرادآبادی

۱۸۹۰ء

علی سکندر جگرؔ ولد علی نظر نظرؔ مرادآباد میں پیدا ہوئے انٹرنس

تک تعلیم پائی۔ حیدرآباد میں داغؔ سے اصلاح لی۔ اور بعد کو امیر اللہ تسلیمؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ اصغرؔ گونڈوی کے معتقد اور تربیت یافتہ ہیں۔ صرف غزل کہتے ہیں اور خاص ترنّم سے سناتے ہیں۔ کلام کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ عہد حاضر کے مقبول ترین غزل گو ہیں۔

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی، کہاں گزرے

جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے
کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے

مجھے یہ وہم رہا مدّتوں کہ جرأتِ شوق
کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گزرے

ہر اک مقامِ محبّت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہلِ محبّت کشاں کشاں گزرے

جنوں کے سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ
حسیں حسیں نظر آئے جواں جواں گزرے

مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں
یہ اک جہاں ہی نہیں سینکڑوں جہاں گزرے

ہجومِ جلوہ میں پروازِ شوق، کیا کہنا
کہ جیسے روح ستاروں کے درمیاں گزرے

خطا معاف، زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں، کہ یہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

رہِ وفا میں اِک ایسا مقام بھی آیا
کہ ہم خود اپنی طرف سے بھی بدگماں گزرے

خلوص جس میں ہو شامل، وہ دورِ عشق و ہوس
نہ رائگاں کبھی گزرا، نہ رائگاں گزرے

اسی کو کہتے ہیں جنّت، اسی کو دوزخ بھی
وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گزرے

بہت لطیف مناظر بھی، حسنِ فطرت کے
نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گزرے

وہ جن کے سائے سے بھی بجلیاں لرزتی تھیں
مری نظر سے کچھ ایسے بھی آشیاں گزرے

مرا تو فرض چمن بندیِ جہاں ہے فقط
مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گزرے

کہاں کا حسن، کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہِ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گزرے

بھری بہار میں تاراجیِ چمن، مت پوچھ
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو، وہ دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گزرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی، مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

ابھی سے تجھ کو بہت ناگوار ہیں ہمدم
وہ حادثات جو اب تک رواں دواں گزرے

جنھیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے
وہ انقلاب ترے سامنے کہاں گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو انھیں کی یاد جگرؔ
وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گزرے

محبت کار فرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ ہر دنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے

ہر اک صورت ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

زمانہ گرمِ رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

جہاں تک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن
دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

نزاکت ہائے احساسِ محبت اے معاذاللہ
کہ اب اک اک گھڑی ایک ایک عالم ہوتی جاتی ہے

غرورِ حسن رخصت، الفراق اے نازِ خود بینی
مزاجِ حسن سے اب تمکنت کم ہوتی جاتی ہے

یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہیے
بہت دلکش ادائے حسنِ برہم ہوتی جاتی ہے

ارے توبہ یہ تکمیلِ شباب وحسن، ارے توبہ
کہ ہر ظالم ادا تقدیرِ عالم ہوتی جاتی ہے

تصوّر رفتہ رفتہ اِک سراپا بنتا جاتا ہے
وہ اِک شے جو مجھی میں ہے، مجسّم ہوتی جاتی ہے

وہ رہ رہ کر گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

جدھر سے میں گزرتا ہوں نگاہیں اُٹھتی جاتی ہیں
مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

جگرؔ تیرے سکوتِ غم نے یہ کیا کہہ دیا اُن سے
جُھکی پڑتی ہیں نظریں آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے

ساقی سے خطاب

کہاں سے بڑھ کے پہونچے ہیں کہاں تک علم وفن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

یہ سُنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کے سر سے کفن ساقی

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار ورسن ساقی

رگ وپے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی

کبھی میں بھی تھا تا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش
مگر بننا ہے اب خنجر بہ کف، ساغر شکن ساقی

نہ لاؤ سوا اس دل میں، جو ہیں تیرے دیکھنے والے

سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دشمن کے لئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں

دلِ خوباں میں چُبھتا ہے انھیں کا بانکپن ساقی

ترے جوشِ رقابت کا تقاضا کچھ بھی ہو، لیکن

تجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب دفعتہً ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جُنوں، تنظیم مے خانہ

ابھی نا معتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی

وہی انساں، جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا

وہی خود سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حُریّت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پُرزے

بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں

بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں ملحد نہ بن جائیں مرے افکار سنجیدہ

کہیں مُرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی

کہیں خود حُسن رہ جائے نہ قومی مِلکیت بن کر

کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

کہاں میں رِندِ سرگشتہ، کہاں یہ دعوئے تمکیں
سمجھ لے اس کو بھی میرا اِک اندازِ سخن ساقی

عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں
بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی

نمودِ صبح کاذب ہی دلیلِ صبح صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ اُبھری کرن ساقی

بدہ جامِ مے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ جمن ساقی

۷۶۔ اثر رام پوری
۱۸۹۲ء

محمد علی خاں احمد زئی رام پور کے رہنے والے اور وہیں کے دربار کے متوسل۔ ابتدا میں جلیلؔ کے اور بعد کو آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ نثر اور نظم دونوں سے شوق رہا۔ ایک مجموعہ وطن کے گیت شایع ہو چکا ہے۔ محاکات اور واقعہ نگاری کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور غیر مانوس الفاظ کو استعمال نہیں کرتے۔

وہ ان کا حجاب اور نزاکت کے نظارے — آئے وہ شبِ وعدہ تصوّر کے سہارے
وہ کالی گھٹا اور وہ بڑھتے ہوئے دھارے — زاہد بھی اگر دیکھے تو ساقی کو پکارے

وہ جلوہ گہہِ ناز وہ مخمور نگاہیں — اب کیا کہوں یہ لمحے کہاں ہیں نے گزارے

خود حسن کا معیار مرا ذوقِ نظر ہے — اتنے ہی حسیں آپ ہیں جتنے مجھے پیارے

بے وجہ نہیں حسن کی تنویر میں تابش — لو دیتے ہیں خاکسترِ الفت کے شرارے

تم چاہو تو دو لفظوں میں طے ہوتے ہیں جھگڑے — کچھ شکوے ہیں بیچارے کچھ عذر تمہارے

پھر جام بکف ہو گئی ہر چیز اثرؔ آج — یاد آ گئے پھر مدھ بھری آنکھوں کے اشارے

وہ جو نہیں بزم میں بزم کی شان بھی نہیں
پھول ہیں دل کشی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں

ڈھونڈھا نہ ہو جہاں اُنھیں ایسی جگہ کوئی نہیں
پائی کچھ ان کی جب خبر اپنی خبر رہی نہیں

آنکھ میں ہو پرکھ تو دیکھ حسن سے پُر ہے کُل جہاں
تیری نظر کا ہے قصور جلووں کی کچھ کمی نہیں

عشق میں شکوہ کُفر ہے اور ہر التجا حرام
توڑ دے کاسۂ مُراد عشق گداگری نہیں

جوشِ جنونِ عشق نے کام مرا بنا دیا
اہلِ خرد کریں معاف حاجتِ آگہی نہیں

اُف یہ نشیلی انکھڑیاں ہائے یہ مستیٔ شباب
مانا کہ تم نے پی نہیں کون کہے گا پی نہیں

ہجر کی شب گزر گئی پھر بھی اثرؔ یہ حال ہے
سامنے آفتاب ہے اور کہیں روشنی نہیں

۷۷۔ جوش ملیح آبادی

۱۸۹۴ء

شبیر حسن خاں ولد بشیر احمد خاں ولد فقیر محمد خاں گویا ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ عزیز لکھنوی سے ابتدا میں اصلاح لی عنفوانِ شباب ہی سے نثر و نظم کے باعث شہرت حاصل کی۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں اردو ترجموں کی تصحیح پر مامور رہے۔ پھر فلمی گیتوں کے سلسلے میں پونہ اور بمبئی میں مقیم رہے۔ آزادیٔ ہند کے بعد حکومت ہند کے رسالہ آج کل کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ملازمت چھوڑ کر پاکستان میں مقیم ہو گئے۔ غزل گوئی سے ابتدا کی تھی اور اب اردو نظم کے بادشاہ ہیں۔ متعدد مجموعے شایع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ روحِ ادب۔ نقش و نگار۔ شعلہ و شبنم۔ حرف و حکایات۔ جنونِ حکمت۔ فکر و نشاط۔ آیات و نغمات۔

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ بُتِ نامہرباں کل رات کو

ناز تھا طغرا کشِ دیوان آداب نیاز
تیغ تھی پیغمبر امن و اماں کل رات کو

چھو رہی تھی دل کو موجِ رنگ تیروں کے عوض
کھنچ رہی تھی ابرؤں کی یوں کماں کل رات کو

لوٹتی تھی کس تکلف سے ہوا کے دوش پر
چاندنی میں کاکلِ عنبر فشاں کل رات کو

الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو

مسندِ زریں پہ سرِ دلبراں کے زمزمے
تھے باندازِ حدیثِ دیگراں کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر — سنبلستاں کا تھا گلِ پر سائباں کل رات کو
پھول تھے غرقِ عرق پانی ہوئے جاتے تھے جام — سُرخ تھیں اس شوخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو
آ رہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا — یوں لبِ گل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو
کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ امید میں — کاکلِ شب رنگ تھا یا تھا بادباں کل رات کو
غیب کے پردے سے آوازیں مبارکباد کی — آ رہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو
سامنے تھی جلوہ گاہِ کرسی و لوح و قلم — اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو
ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا — ہر نفس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو
وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں — ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو
وہ ترنم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے — زیست کی ہر شے تھی اک جنسِ گراں کل رات کو
چاندنی دریا شگوفے راگنی بربطِ شراب — چھٹ رہی تھیں نرم پر نگبینیاں کل رات کو
نرگسِ مخمور و آبِ آتشین و موجِ گل — ہر طرف تھیں سرخیاں ہی سرخیاں کل رات کو
گردنِ مینا جھکاتے ہی اُبل پڑتے تھے جام — گنگنا اُٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو
وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں میں روشنی — رقص میں تھا پرتوِ رطلِ گراں کل رات کو
ناز کرتی جس طرح گردوں پہ جاتی ہے دُعا — اُٹھ رہا تھا مشعلوں سے یوں دھواں کل رات کو
محفلِ زہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرود — آسماں پر بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو
میں بھی لافانی ہوں مثلِ وجہِ ربِّ ذوالجلال — دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو
جوش کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں — حیف اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو

اُٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی — یہ بربط ہی یہ مے آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آ سکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی

سُناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

ادھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

ادھر شدت کے ساتھ اعلان ہے اتمامِ نعمت کا
ادھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہوگی اس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
یہ کس آغاز کی سعیِ زبوں انجام ہے ساقی

یہ کس کی مہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا جوانی دل کو روتی تھی
نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

تمنّائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سُلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں موجِ ہوا تک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسّم اک بڑی دولت ہے میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آبِ صاف بھی افسردۂ اصنام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیّام ہے ساقی

۷۸۔ فراؔق گورکھپوری

۱۸۹۶ء

رگھوپتی سہائے فراؔق ولد گورکھ پرشاد عبرتؔ گورکھپور کے سری واستو کالیستھوں میں سے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں ایف اے کا امتحان فارسی کے ساتھ کامیاب کیا۔ بی اے اور پی سی ایس بھی ہوئے۔ کچھ عرصے ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ازدواجی زندگی کی ناکامی کے باعث ملازمت ترک کر کے ۱۹۱۷ء میں کانگریس میں شامل ہو گئے اور قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ آج کل الٰہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے اُستاد ہیں۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ اقباؔل کو اُستاد مانتے ہیں ردیف و قافیہ کے پابند اور طرزِ جدید کے خلاف ہیں۔

فسُردہ پا کے محبت کو مُسکرائے جا
اب آگیا ہے تو اِک آگ سی لگائے جا

اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

مٹا مٹا کے محبت سنوار دیتی ہے
بگڑ بگڑ کے یوں ہی زندگی بنائے جا

وہ کیمیا ہی سہی پہلے خاک ہونا ہے
ابھی تو سوزِ نہانی کی آنچ کھائے جا

ابھی تو لے غمِ پنہاں جہان بدلا ہے
ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا

کُھلیں نہ حُسن کی فطرت کے راز عاشق سے
برتِ خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا

خلوصِ عشق کو کر ماورائے غفلت و ہوش
کسی کو یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا

شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار ابھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا
فراقؔ چھیڑ دیا تو نے کیا فسانۂ درد سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر سنائے جا

عشق کے ہاتھوں دل و جاں شاد ہیں آباد ہیں
رہ گئیں تیری جفائیں وہ بھی کچھ کچھ یاد ہیں
عشق والوں کی نہ پوچھو شاد ہیں آباد ہیں
سو طرح آباد ہو کر سو طرح برباد ہیں
بس انھیں کے فیض سے ویرانیاں آباد ہیں
ہر ادائے حسن میں سو عالمِ ایجاد ہیں
زندگی پر ایک تہمت ہے یہ نظمِ زندگی
عشق پر جس طرح سب الزام بے بنیاد ہیں
آج تک خونِ تمنا سے بسی ہیں جنتیں
تیرے اٹھتے درد سے سینے ابھی آباد ہیں
کیا عجب نکلے جو کارِ حسن بھی کارِ دراز
ہم اسیرانِ ستم قیدیٔ بے بنیاد ہیں
یہ جھکی نظریں تری یہ زیرِ لب باتیں تری
داستاں در داستاں روداد در روداد ہیں

موجِ تغزّل

ہم ایک بات کہیں گے نیاز و ناز سے دُور
اگر ہے حسن میں نخوت تو عشق بھی ہے غیور

مخاطب اہلِ طرب سے ہے نرگسِ مخمور
تمام ہوش کی باتیں ہیں اور نشے میں چور

دلِ حزیں میں مرے پُھنک رہے ہیں صد ہا صور
سکوتِ غم میں نہاں صد ہزار شور نشور

یہ کس لئے اُٹھے ہنگامہ ہائے دار و رسن
صدا زنِ انا الانساں ہیں آج کے منصور

تمام کرشمۂ ناتمام موسیٰ کو
وہ جام اُٹھا کہ جھپک جائے چشمِ شعلۂ طور

دماغ ہی نہیں ملتے ترے فقیروں کے
نظر میں جچتی نہیں سطوتِ کے و فغفور

مصالحت غمِ دوراں سے ہم نے بھی کر لی
کوئی نہیں ترا دُنیا میں اے دلِ رنجور

یہ سانحے دلِ غمگیں ہوا ہی کرتے ہیں
نہ عشق ہی کی خطا ہے نہ حسن ہی کا قصور

تعینات زمان و مکاں سے قطع نظر
یہ تجربے بھی رہے ہیں کوئی قریب نہ دور

کچھ آج زندہ دِلوں کا تھا ذِکر آپس میں
کہ یاد آ ہی گیا یک بہ یک دلِ فغفور

میں ہو چکا تھا دو عالم کو چھان کر مایوس
غریب خانہ، دل میں کہاں سے آئے حضور

مشیتوں کو بدلتے ہیں زورِ بازو سے
بشر جو چاہے قضا و قدر بھی ہوں مجبور

قدم اُٹھاتے ہی شکوے رہِ محبت کے
ابھی سے پاؤں میں چھالے ہنوز دِلّی دُور

بنا دیا ہے بازیچہ گاہ ہجر و وصال
یہ کون ہے مرے دل کے قریں نگاہ سے دُور

چمک سی جاتی ہے رہ رہ کے نیم تیرہ فضا
گُزر رہا ہے کوئی جھٹپٹے میں بقعۂ نور

ہزار باتوں کی اِک بات داستانِ جمال
اب اس میں خواہ زباں بھی کٹے کہیں گے ضرور

یہاں جو حُسنِ بیاں ہے وہ بے تکلّف ہے
نگاہِ ناز کو اظہارِ غم نہیں منظور

نہ زعم فن نہ اسے دعوائے زباں دانی
نہ جانے کر دیا کِس نے فراقؔ کو مشہور

۷۹۔ حامد اللہ افسر

۱۸۹۸ء

مولانا مفتی محمد عصمت اللہ میرٹھی کے فرزند ہیں۔ میرٹھ کے معزز خاندانِ علما سے تعلق ہے۔ مدرسہ عالیہ عربیہ میں تعلیم پائی۔ شمس العلماء، نذیر احمد دہلوی سے بھی دو سال تک استفادہ کیا۔ ۱۹۲۱ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ پھر علی گڑھ میں ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی جماعتوں میں شریک ہوئے لیکن بوجہ علالت تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۲۷ء میں جوبلی کالج لکھنؤ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن لکھنؤ ہی میں مقیم رہے۔ مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ نظم کے مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ پیامِ روح۔ جوئے رواں۔ بچوں کے افسر۔

وطن کا راگ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رُت ہر اک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے

کیسا سُہانا کیسا سُندر پیارا دیش ہمارا ہے
دُکھ سُکھ میں ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے
پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے

بھارت کی رکھشا کرتا ہے بھارت کا رکھوالا ہے
لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں لاکھوں ندیوں والا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سُناتی جاتی ہیں
صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں
کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے دُنیا کو اَن دیتے ہیں
چاندی سونے کی کانوں سے ہم جگ کو دھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں
امن و اماں کی نعمت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے روح ہماری جانوں میں
گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتیؒ نے جو دی تھی مے وہ اب تک ہے پیمانوں میں
نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں
بھارت نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے سودائی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

راجا پرجا سب کے مالک سب کا ناتا تجھ سے ہے
دیش میں شوبھا جو کچھ ہے اے دیش کے داتا تجھ سے ہے
بھارت بھاگ بنا دینے کی آس ودھاتا تجھ سے ہے
داتا اب آشس کی بھکاری بھارت ماتا تجھ سے ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

فلسفۂ کامیابی

جو سب سے بدتر تھے اس جہاں میں ہیں ان کے وارث ہی سب سے بہتر
رکاوٹیں جس قدر ہوں پیدا اسی قدر کامیاب ہو گے

یہ چھاؤں جس سے گزر رہے ہو ثبوت بیّن ہے دھوپ کا خود
شکست کا لطف پا چکے ہو تو ایک دن فتح یاب ہو گے

خزاں اجاڑے گی جس چمن کو بہار آئے گی اس چمن میں
اسے خوشی بھی نہ ہو گی حاصل جسے کبھی غم نہیں رہا ہے

خدا رسیدہ بزرگ ہونا اسی سے ممکن ہے اس جہاں میں
گناہ گاروں میں جو یہاں کے کسی سے کچھ کم نہیں رہا ہے

جو بے بسی میں گرے ہیں افسردہ ہی تو گہرائی سے ہیں واقف
جو دل سے نکلا ہے کوئی نالہ فلک پہ وہ با اثر رہا ہے
بلندیوں پر وہی چڑھے گا نشیب میں جو اتر سکے گا
جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ وہ گھاٹیوں سے گزر رہا ہے

۸۰۔ ہری چند اختؔر

۱۹۰۰ء ۱۹۵۷ء

ضلع ہوشیار پور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے فارسی میں کامیاب کیا۔ فطری ذوق ہے۔ پنجاب اسمبلی اور حکومتِ ہند کے محکمہ نشر و اشاعت میں ملازم رہے۔ ۱۹۵۶ء میں وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ نثر و نظم میں مزاح طنز ان کی خصوصیات ہیں۔ عرصے تک لاہور کی ادبی محفلوں میں مقبول رہے۔ تقسیم کے بعد دہلی آگئے جہاں ۱۹۵۷ء میں انتقال ہوا۔

غرورِ ضبط سے آہ و فغاں تک بات آپہنچی
ہوس نے کیا کیا دل سے زباں تک بات آپہنچی

سکونِ دل سے ناقوس و اذاں تک بات آپہنچی
خدا والوں کی ہمت سے کہاں تک بات آپہنچی

خلافت سے جبینِ و آستاں تک بات آپہنچی
خدا اور ابنِ آدم میں یہاں تک بات آپہنچی

ملی تھی آنکھ اور آہ و فغاں تک بات آپہنچی
ذرا سی بات تھی لیکن یہاں تک بات آپہنچی

ہماری داستاں میں ذکرِ قیس و کوہ کن آیا
وہاں سے پھر ہماری داستاں تک بات آپہنچی

جہانِ دوستی اِک جنتِ ایثار ہوتا ہے
وہاں بھی کاہشِ سود و زیاں تک بات آپہنچی

شیخ و پنڈت دھرم اور اسلام کی باتیں کریں
کچھ خدا کے قہر کچھ انعام کی باتیں کریں

یہ سُنائیں پاک نغمے اوّلیں الہام کے
وہ خدا کے آخری پیغام کی باتیں کریں

ہم کھڑے سُنتے رہیں اور دل میں یہ کہتے رہیں
اب یہ رُخصت ہوں تو ہم کچھ کام کی باتیں کریں

یاس و حرمان و غم و آلام کی باتیں کریں
آ دلِ ایذا طلب کچھ کام کی باتیں کریں

دوست سے کہہ دیں دلِ بے مدّعا کی داستاں
آج ساقی سے شکستِ جام کی باتیں کریں

جس کی دُنیا آپ سے تھی جس کی دُنیا آپ تھے
آؤ اس بدبخت کے انجام کی باتیں کریں

عمر بھر کا عہدِ اُلفت اِک خیالِ خام تھا
آؤ لیکن اس خیالِ خام کی باتیں کریں

زندگی بے شک ترا انعام ہے یارب مگر
سُن سکے تو کچھ ترے انعام کی باتیں کریں

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

انھیں دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

خدا جانے یہ ہے اوجِ یقیں یا پستیٔ ہمت
خدا سے کہہ رہا ہوں ناخدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نویدِ سربلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

۸۱۔ حفیظ جالندھری

۱۹۰۰ء

ابو الاثر محمد حفیظ ولد حافظ شمس الدین جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں غلام قادر گرامی سے اصلاح لی۔ متعدد پیشے اور تجارتیں کرتے رہے۔ کشمیر ریڈیو میں بھی کام کیا۔ شاہنامۂ اسلام کے اشاعت کے بعد سے ان کی شہرت اور قدر منزلت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ آج کل پاکستان کے مشاہیر شعرا میں شمار ہے۔

تو ہی بھروسا تو ہی سہارا پروردگارا پروردگارا
منظور منظور اے اہلِ دُنیا اللہ میرا باقی تمہارا
یوں میں نے جیتی الفت کی بازی اِک بار کھیلا سو بار ہارا
یہ ناخدا ہے لئے اہلِ کشتی شاید کسی وقت کرے کنارا
عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی وہ بھی نہ ہارے میں بھی نہ ہارا

دِل ابھی تک جوان ہے پیارے کِس مصیبت میں جان ہے پیارے
رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات یہ بڑی داستان ہے پیارے
جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں یہ ہماری زبان ہے پیارے
تلخ کر دی ہے زندگی جس نے کتنی میٹھی زبان ہے پیارے
جانے کیا کہہ دیا تھا روزِ ازل آج تک امتحان ہے پیارے

ہم ہیں بندے مگر فقط تیرے — یہ ہماری ہی شان ہے پیارے
کب کیا میں نے عشق کا دعویٰ — تیرا اپنا گمان ہے پیارے
میں تجھے بے وفا نہیں کہتا — دشمنوں کا بیان ہے پیارے
تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ — ہر زمیں آسمان ہے پیارے
ساری دنیا کو ہے غلط فہمی — مجھ پہ تو مہربان ہے پیارے
بزم ہے احتراز ہی کیا ہے — پردہ سا درمیان ہے پیارے
عرضِ مطلب سمجھ کے ہو نہ خفا — یہ تو اک داستان ہے پیارے

میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے — پھر آگیا کوئی رخِ زیبا لئے ہوئے
پھر دل میں آبسی ہے کسی انجمن کی یاد — اجڑے ہوئے بہشت کا نقشا لئے ہوئے
یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر — بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لئے ہوئے
دِل گیسوئے بتاں میں الجھ کر نہ گر پڑے — اٹھا تو ہے خدا کا سہارا لئے ہوئے
اِس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے — اک حشر اٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے
حسرت برس رہی ہے رخِ نامراد پہ — یہ کون جا رہا ہے تمنا لئے ہوئے
آئی ہے بے حیا مرا ایمان لوٹنے — دنیا کھڑی ہے دولتِ دنیا لئے ہوئے
گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی حفیظؔ — پھرتا ہوں اک جہان کا شکوا لئے ہوئے

۸۲- عبد السمیع پال اثرؔ صہبائی

۱۹۰۱ء

عبد السمیع پال ولد احمد دین پال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں ایل ایل بی اور ۱۹۲۹ء میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وکیل ہیں۔ ابتدا میں اپنے بڑے بھائی امین حزیںؔ کو کلام دکھاتے تھے۔ کیفیؔ اور اثرؔ لکھنوی سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے مجموعے جامِ صہبائی ۱۹۲۸ء۔ چمنستاں ۱۹۳۳ء۔ جامِ طہور ۱۹۳۷ء۔ راحت کدہ ۱۹۴۳ء روحِ صہبائی ۱۹۴۵ء۔ بامِ رفعت ۱۹۵۴ء شایع ہو چکے ہیں۔ جموں و کشمیر میں پبلک پراسی کیوٹر تھے اور اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد سیالکوٹ چلے گئے اور وہاں اسی عہدے پر مامور ہوئے۔ اب لاہور میں پبلک پراسی کیوٹر ہیں۔

ظلمتِ دشتِ عدم میں بھی اگر جاؤں گا — لے کے ہمراہ مہِ داغِ جگر جاؤں گا

عارضِ گُل ہوں نہ میں دیدۂ بُلبُل گلچیں — ایک جھونکا ہوں فقط سن سے گزر جاؤں گا

اے فنا ٹوٹ سکے گی نہ کبھی کشتیٔ عمر — میں کسی اور سمندر میں اُتر جاؤں گا

دیکھ جی بھر کے مگر توڑ نہ مجھ کو گلچیں — ہاتھ بھی تو نے لگایا تو بکھر جاؤں گا

ایک قطرہ ہوں مگر سیلِ محبت سے ترے — ہو سکے جو نہ سمندر سے بھی کر جاؤں گا

دُور گلشن سے کسی دشت میں لے جا صیّاد — ہم صفیروں کے ترانوں میں تو مر جاؤں گا

صحنِ گلشن میں کئی دام بچھے ہیں اے اثرؔ — اُڑ کے جاؤں بھی اگر میں تو کدھر جاؤں گا

یا ڈوب جائیں لب مرے موجِ شراب میں — یا موسمِ بہار نہ آئے شباب میں

انگڑائی لیتے اُٹھے جو وہ خوابِ ناز سے — ہر چیز غرق ہو گئی رنگِ شباب میں

ڈوبی ہوئی نگاہ ہے رنگِ حجاب میں — یا کوئی نوشگفتہ کلی نیم خواب میں

جس حسن کی ہے چشمِ تمنّا کو جستجو
وہ آفتاب میں ہے نہ ہے ماہتاب میں
ہستی کو پھونک دیں گے اثر شعلہ ہائے عشق
خاک سیاہ ہو کے رہو گے شباب میں

۸۳ - آنند نرائن مُلّا

۱۹۰۱ء

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت جگت نرائن مُلّا کشمیری برہمن تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ایم اے ایل ایل بی کی ڈگریاں لے کر وکالت شروع کی۔ ادب اردو کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ شعر و سخن کا ابتدا ہی سے ذوق ہے۔ غزلیں اور نظمیں نہایت شگفتہ اور سنجیدہ لکھتے ہیں۔

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سُنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی
اتنا تو یاد سا ہے کہ ہم تھے جواں کبھی
پھرتی ہیں کچھ نگاہ میں پرچھائیاں کبھی
دو گُل قفس میں رکھ کے نہ صیاد دے فریب
دیکھا ہی ہم نے جیسے نہیں آشیاں کبھی
بھولے ہوئے ہو تم تو دلائیں گے ہم نہ یاد
ہم تم بھی راہ زیست میں تھے ہم عناں کبھی
ویرانیٔ نگاہ پہ میری نہ جائیے
پلتی تھیں اس کے سائے میں بھی بجلیاں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف
پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی
مُلّا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اُردو زباں کبھی

تُم

سحر کی یاد ہو تُم اور خیالِ شام ہو تُم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

تمھیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے　　تمھیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں کو روپ کی گہرائیوں میں دیکھا ہے　　جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم

ہر اک اُمید کا میری تمھیں ہو گہوارہ　　تمھیں ہو جیسے ہر اک درد کا مرے چارہ
تمھیں پہ آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ　　ہر ابتدائے تمنّا کا اختتام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم

میں کون اِک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد　　تم ایک بزم کی زینت تم اِک چمن کی مُراد
کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد　　مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم

اُفقِ حیات کا پھر بھی تمھیں سے ہے زرّیں　　ہر ایک خوابِ تصور تمھیں سے ہے رنگیں
تمھاری سمت ہے دل کی نگاہ بازپسیں　　اندھیری زیست کی اک زرنگار شام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم

کروں میں عرضِ تمنّا مری مجال نہیں　　سوال دل میں ہے اور جرأتِ سوال نہیں
تمھاری یاد سے غافل مگر خیال نہیں　　میں کچھ کہوں نہ کہوں حاصلِ کلام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

خموشیوں میں ہے دمساز کون تم جو نہیں　　نظر نظر کا مری راز کون تم جو نہیں

نفس نفس کی ہے آواز کون تم جو نہیں　　پیام بر ہوں اگر میں مرا پیام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

کسی نگاہ کا جو دِل غلام ہو نہ سکا　　جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آج تک نہ جھکا

تمھارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا　　تو کیا جہان کا مُلّا سے انتقام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

۸۴۔ جمیل مظہری

۱۹۰۵ء

حسن پورہ ضلع سارن بہار میں پیدا ہوئے۔ ذہنی ارتقا کلکتے میں ہوا۔ وہیں تعلیم پائی اور ایم اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت ہند کے محکمۂ نشر و اشاعت میں شعبۂ اردو کے پبلیسٹی آفیسر ہوئے۔ ۴۲ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دیا اور جیل بھی گئے۔ رہائی کے بعد جوشؔ کے توسط سے فلم کمپنیوں میں مکالمہ نویس اور نغمہ نویس رہے۔ ۱۹۴۷ء میں مرکزی حکومت کے محکمۂ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائرکٹر بنائے گئے۔ اب پٹنہ کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ رضا علی وحشتؔ کے شاگرد ہیں۔

اور مولانا آزاد۔ نصیر حسین خیال اور آغا حشر کشمیری سے استفادہ کیا۔

بہار کی جدید شاعری کے علمبردار ہیں۔

آدمِ نَو کا ترانۂ سفر

فریب کھائے ہیں رنگ و بُو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں
مگر نتائج کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آرہا ہوں

جو دل کی گہرائیوں میں صبحِ ظہورِ آدم سے سو رہی ہے
میں اپنی فطرت کی اِن خداداد قوتوں کو جگا رہا ہوں

میں سانس لیتا ہوں ہر قدم پر کہ بوجھ بھاری ہے زندگی کا
ٹھہر ذرا گرمِ رُوزمانے کہ میں ترے ساتھ آرہا ہوں

جہاز رانوں کو بھی تعجب ہے میرے اس عزمِ مطمئن پر
کہ آندھیاں چل رہی ہیں تُند اور میں اپنی کشتی چلا رہا ہوں

طلسمِ فطرت بھی مُسکراتا ہے میری افسوں طرازیوں پر
بہت سے جادو جگا چکا ہوں بہت سے جادو جگا رہا ہوں

یہ مہرِ تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گِن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرّے ذرّے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

مرا تخیّل مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پر ہیں لرزاں میں اس بلندی پہ جا رہا ہوں

یہ وہ گھروندے ہیں جن پہ اک دن پڑے گی بنیادِ قصرِ جنّت
نہ سمجھیں سکانِ بزمِ عصمت کہ میں گھروندے بنا رہا ہوں

جمیل مظہری

یہ نازپروردگانِ ساحل ڈریں مری سعیٔ گرم رَو سے
کہ میں سمندر کی تُند موجوں کو روندتا پاس آرہا ہوں

تغیرات

پلٹ دیا ہے حوادث نے رُخ زمانے کا
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی

اثر بلندیٔ تخئیل سے اُتر آئے حسن
کہ اب جہاں میں نظر کوئی دُوربیں نہ رہی

نیاز و ناز کی دُنیا میں انقلاب آیا
صنم صنم نہ رہے اور جبیں جبیں نہ رہی

جبیں کے پاس کوئی سجدہ "بُت رُبا" نہ رہا
بُتوں کے پاس ادا کوئی دل نشیں نہ رہی

حریفِ ناز و ادا صبر عاشقاں نہ رہا
نگاہِ لُطف بتاں ذوق آفریں نہ رہی

جگہ نہیں ہے تڑپنے کی بے قراروں کو
جہانِ شوق میں اتنی بھی اب زمیں نہ رہی

ہے دردِ سر کو یہ شکوہ کہ رنج بالیں ہوں
ہے چشمِ تر کو یہ رونا کہ آستیں نہ رہی

کچھ اس طرح یہ ہوس کی ہے گرم بازاری
کہ جنس معتبرِ آرزو کہیں نہ رہی

کھُلا ہوا ہے ابھی میکدے کا در لیکن
کسی کے ساغرِ دل میں مئے یقیں نہ رہی

جہاں میں خشک ہے کشتِ حیات و مزرعِ عشق
کہ خونِ پاک مسلماں سے تر زمیں نہ رہی

۸۵ - ساغر نظامی

۱۹۰۵ء

صمد یار خاں ولد احمد یار خاں قلعہ علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک تعلیم پائی اور شعر و سخن میں مشغول ہو گئے۔ ابتدا میں سیماب اکبر آبادی سے استفادہ کیا تھا۔ میرٹھ سے رسالہ "ایشیا" نکالا جو ایک بلند پایہ رسالہ

ثابت ہوا۔ جوشؔ کی طرح فلمی گانوں کے سلسلے میں عرصے تک بمبئی میں
رہے۔ آج کل آل انڈیا ریڈیو دلی میں ہیں۔ کلام کے کئی مجموعے شایع
ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں :- صبوحی۔ شبابیات۔ بادۂ مشرق۔

گیت

جیون تج کر ہم نے ڈھالا یہ جیون کا شوالہ
جس کے کلس آکاش کو چومیں دھووے چرن ہمالہ

یہ جیون کا شوالہ دیکھو۔ یہ جیون کا شوالہ
جیون تج کر ہم نے ڈھالا یہ جیون کا شوالہ

اس مندر میں ہم ہی بھگوان۔ ہم ہی اپنے داس
ہم ہی دیپک ہم ہی جوتی ہم پھولوں کی باس
ہم نے زنجیروں کو گلا کر۔ ڈھالی سُندر مالا
محنت کی یاں پوجا ہووے۔ امن کا دیپک بارے
چاند اور سورج کو شرمائیں۔ اپنے پانچ ستارے
قربانی نے جنھیں تراشا۔ غم نے جن کو ڈھالا
شاہ جہاں نے تاج بنایا، توت رخ من اہرام
تغلق نے مینار اٹھایا بودھوں نے اصنام
ہم نے عجب اک چاند بنایا سورج جس کا ہالا

گاؤں بدل کر اپنا بانا، شہروں کو مسکائیں
جھونپڑیاں انگڑائی لے کر محلوں کو شرمائیں
چمن کھِلاتا چلا گیا ہے تلوؤں کا ہر چھالا

ذرّے ذرّے میں وہ آشا اپنی جوت جگائے
اس کے کومل سانس کی گرمی تن من کو دہکائے
لاکھ جگوں سے جو آشا تھی سپنوں کی اِک بالا

موڑ دیئے ہمّت سے ہم نے دریاؤں کے دھارے
دل ہیں طوفانوں کے اُبھارے ہم نے نئے کنارے
یہ دیکھو قوّت کا خزانہ ننگل ڈیم نرالا

ہم ہی راجا، ہم ہی پرجا، ہم ہی خاص عوام
ہم ہی ساقی، ہم ہی بادہ ہم ہی چھلکتے جام
ہم نے کھولی ہر نیرس میں ایک نئی مدھ شالا
جیون تج کر ہم نے ڈھالا یہ جیون کا شوالا
یہ جیون کا شوالہ دیکھو یہ جیون کا شوالا

صدیوں کی شبِ غم کو سحر ہم نے بنایا
ذرّات کو خورشید و قمر ہم نے بنایا
تخلیق اندھیروں سے کئے ہم نے اُجالے
ہر شب کو اِک ایوانِ سحر ہم نے بنایا
ہر قاب کے سینے میں کیا ہم نے چراغاں
ہر موجۂ دریا کو شرر ہم نے بنایا
شبنم سے نہیں رنگ دیا دل کے لہو سے
ہر خار کو برگِ گُلِ تر ہم نے بنایا

ہر موج میں محراب و در و بام تراشے
طوفان کے آغوش میں گھر ہم نے بنایا

ہر خار کے سینے سے چمن ہم نے کھلائے
ہر پھول کو فردوسِ نظر ہم نے بنایا

گیسو کو ترے کب تھا بکھرنے کا سلیقہ
شائستۂ اربابِ نظر ہم نے بنایا

رفتار کو کھلتے ہوئے غنچوں کی صدا دی
ہر گام پر اک خلدِ نظر ہم نے بنایا

ہر رخ سے ترے حسن کی ضو پھوٹ رہی ہے
کیا زاویۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

بے خونِ جگر شبنمِ بے رنگ تھے آنسو
آنسو کو مگر لعل و گہر ہم نے بنایا

خود بڑھ کے ڈھلے نور کے سانچوں میں اندھیرے
یادوں کو تری شمعِ بصر ہم نے بنایا

جب برق ہوئی شعلہ فگن لالہ و گل پر
ہر پھول کی پتّی کو سپر ہم نے بنایا

حسرت سے جسے دیر و حرم دیکھ رہے ہیں
وہ خم کدۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

ہٹ کر روشِ عام سے اک راہ نکالی
کانٹوں سے بھرا راہ گزر ہم نے بنایا

گر شوقِ تصادم ہے تو ٹکرائے زمانہ
اک عمر میں پتّھر کا جگر ہم نے بنایا

ڈھلتے ہیں جہاں بادۂ تجدید کے ساغر
وہ میکدۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

۸۶ - ماہر القادری

۱۹۰۶ء

منظور حسین ماہر القادری فرزند ہیں محمد معشوق علی ظریف کے۔ کیسر کلاں ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور اس کے بعد فارسی و اردو کا مطالعہ جاری رکھا اور شعر و سخن میں منہمک ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد جا کر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت کی

قدر دانی سے فیض یاب ہوئے اور مختلف محکموں باب حکومت، معتمدی،
فوج اور عدالت میں کئی سال تک ملازمت کی۔ یکایک ملازمت چھوڑ کر فلمی ڈراموں
کے گانے لکھنے لگے اور ۱۹۴۷ء میں کراچی پہنچے اور اب تک وہیں قیام ہے۔
۱۹۴۹ء سے ایک ماہ نامہ فاران نکالتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں عراق کا اور
۱۹۵۴ء میں حجاز کا سفر کیا۔ نظم و نثر دونوں کے ماہر ہیں اور بیس ۲۰ کتابیں اور
مجموعے شایع کر چکے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی دلکش ہے اور بہت مقبول
شاعر ہیں۔ نظم کے مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ محسوساتِ ماہر، نغماتِ ماہر،
جذباتِ ماہر، ذکرِ جمیل، فردوس۔

جمنا کا کنارا

ساون کی گھٹا اور وہ جمنا کا کنارا
وہ منظرِ دل چسپ وہ رنگین نظارا

جامن کے درختوں سے جو کچھ آگے بڑھا میں
آئی نظر آتی ہوئی اِک شوخ دل آرا

اللہ رے اٹھلاتی ہوئی چال کی شوخی
رک جائے جسے دیکھ کے بہتا ہوا دھارا

نکھرے ہوئے ماتھے پہ وہ رنگین سا قشقہ
جس طرح گھٹاؤں میں دہکتا ہوا تارا

قشقے پہ وہ چاندی کا چمکتا ہوا جھومر
جس طرح کہ انگارے پہ بکھرا ہوا پارا

لہریں جو قریب آئیں تو دامن کو سنبھالا
اِک ہاتھ سے نقشین سی گاگر کو اُتارا

پہلے تو ہر اک شئے کو بڑے غور سے دیکھا
پھر جھک کے بڑے ناز سے ہاتھوں کو نکھارا

پیرِ حسن کے کڑوں کو کبھی بچھوؤں کو گھمایا
گاگر کو اُجالا کبھی بالوں کو سنوارا

پانی سے چھلکتی ہوئی گاگر کو اُٹھایا
لیتے ہوئے معصوم اداؤں کا سہارا

آتا مجھے دیکھا تو وہ جھجکی کبھی ٹھٹکی
شاید مرا آنا نہ ہوا اس کو گوارا

دیکھا نہ گیا حسن کی مجبوری کا عالم
میں اس سے یہ کہتا ہوا بستی کو سدھارا

او بتکدۂ ہند کے بے ترشے ہوئے بت
بخشم بہ نگاہے تو سمرقند و بخارا

یک بار باین ناز بیا بر لبِ جمنا
یک فرصتِ نظارہ بدہ باز خدارا

غزل

کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے
دِل کی ہر چوٹ اُبھر آئی ہے

درد بدنام تمنّا رُسوا
عشق رُسوائی ہی رُسوائی ہے

اس نے پھر یاد کیا ہے شاید
دِل دھڑکنے کی صدا آئی ہے

زلف و رُخسار کا منظر توبہ
شام اور صبح کی یکجائی ہے

ہم سے چھُپ چھُپ کے سنورنے والے
چشمِ آئینہ تماشائی ہے

دل تمنّا سے ہے کتنا بیزار
ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے

تم سے ماہر کو نہیں کوئی گلہ
اس نے قسمت ہی بُری پائی ہے

۸۷ ۔ بالمکند عرش ملسیانی

۱۹۰۸ء

ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ جوش ملسیانی کے فرزند ہیں۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ انجینیرنگ کالج سے اورسیری کا بھی امتحان پاس کیا اور پہلے محکمہ نہر میں ملازم ہوئے۔ پھر گورنمنٹ اسکول لدھیانہ میں ملازمت کی۔ آج کل حکومتِ ہند کے اردو ماہنامہ "آجکل" کے مدیر ہیں۔ نثر و

نظم دونوں کے دھنی ہیں اور مقبول شاعر ہیں۔

نگاروں کا دیس (کشمیر)

آبشاروں بہاروں نظاروں کا دیس
وادیوں ندیوں کوہساروں کا دیس

سر بسر نغمہ چشموں کی یہ سرزمیں
سر بسر سبزہ یہ سبزہ زاروں کا دیس

درحقیقت ہے فردوس روئے زمیں
انتخاب جہاں یہ بہاروں کا دیس

لالہ کاری ہے فطرت کی ہر باغ میں
یہ حسیں دیس ہے لالہ زاروں کا دیس

گیت گاتی ہوئی ندیوں کی زمیں
شور کرتے ہوئے آبشاروں کا دیس

جنگلوں کی سکون بخش دل کش زمیں
مہر برلب حسیں کوہساروں کا دیس

یہ سیہ چشم رعنا غزالوں کا گھر
یہ حسیں مہ جبیں ماہ پاروں کا دیس

یہ پہاڑوں کا اونچی چٹانوں کا گھر
یہ درختوں کی لمبی قطاروں کا دیس

چیڑ کیل اور اخروٹ کی سرزمیں
دیوداروں سفیدوں چناروں کا دیس

تند موسم کے حملوں کی آماج گاہ
قدرتی گھاٹیوں کے حصاروں کا دیس

ساز بجتے ہیں گاتے ہیں جھرنے یہاں
ہے یہی زمزموں کا ملاروں کا دیس

سرخ پھولوں سے پیراستہ سرزمیں
سبز پتوں سے پُر شاخساروں کا دیس

روئے دریا پہ اک تیرتی زندگی
کشتیوں ہاؤس بوٹوں شکاروں کا دیس

جن کو طوفاں کی تندی کا کچھ ڈر نہیں
ان نڈر مانجھیوں پختہ کاروں کا دیس

زعفراں کے زرا فروز کھیتوں کا گھر
یہ زمرد بھرے مرغزاروں کا دیس

جو وطن کی محبت میں قرباں ہوئے
ان جیالے جری جاں نثاروں کا دیس

جن کو دہقان کے غم نے غمگیں کیا ان حقیقت نگر غم گساروں کا دیس
آج محنت کشوں کا سہارا ہے یہ جس کو کہتے تھے سب بے سہاروں کا دیس
اب تو جاتا ہے یاں تک ہوائی جہاز اب نہیں یہ خیالی غباروں کا دیس
مسکنِ خلق اور آشتی کی زمیں عظمتِ ملک کے پاسداروں کا دیس
مل کے بھارت سے جس کو مرادیں ملیں محترم مغتنم کامگاروں کا دیس

ٹیسو کا بن

شاخوں پہ دہکتے ہوئے ٹیسو کی بہاریں یا سرخ لبادوں میں ہیں حوروں کی قطاریں
یہ نور میں ڈوبے ہوئے اشجار کے جھل بل اک جشنِ بہاراں ہے کہ جنگل میں ہے منگل
پہنے ہوئے اشجار ہیں پوشاک زری کی یا فوج اتر آئی ہے اک لال پری کی
لپکا ہوا کوندا ہے ہر اک شاخ کا جوبن بجلی نے درختوں پہ بنائے ہیں نشیمن
انوار کے یہ سرخ عساکر سرِ کہسار جنت سے تو آئے نہیں کرتے ہوئے یلغار
اک پیرہنِ سرخ زسر تا بقدم ہے فطرت کی سہاگن ہے کہ اک حورِ ارم ہے
جنگل کو بہاروں نے ہے اک آگ لگائی اے حسن کے سیلاب دہائی ہے دہائی
اللہ رے یہ سرخیِ افسانۂ فطرت لبریز مئے سرخ ہے پیمانۂ فطرت
جھونکے پہ ہوا کے ہے گماں ساغرِ مل کا دیتا ہے ہر اک برگ جواب آتشِ گل کا
ٹیسو کا یہ بن جلوہ گہِ نورِ جہاں ہے راتوں کو یہاں دن کے اجالے کا سماں ہے
کچھ دور سرِ کوہ وہ ٹھہرا ہوا لاوا یا اشترِ خاکی پہ ہے اک سرخ کجاوہ
میدان میں پہنے ہوئے یا کیسری بانا "جوہر" کے لئے نکلے ہیں چتوڑ کے رانا

یا ڈھونڈ کے شہروں سے بہت دُور بسیرا — بھکشو ہیں سرِ کوہ جمائے ہوئے ڈیرا

جس شاخ کو دیکھو وہی پھولوں کی چھڑی ہے — انوار کی اِک دھار ہے جو پھوٹ پڑی ہے

نعلیں لبِ فطرت پہ ہنسی آئی ہوئی ہے — بوٹوں نے سنگاروں کی قسم کھائی ہوئی ہے

سیندور چھڑکتی ہوئی اُٹھتی ہے جوانی — یا ہے کسی مہجور کی خوں نابہ فشانی

لالی یہ شفق کی ہے کہ ہے خونِ شہدا کی — یا دستِ بہاراں پہ ہے سُرخی یہ حنا کی

فطرت کا رُخِ سادہ مسرت سے ہے لال آج — اُڑتے ہیں فضاؤں میں عبیر اور گُلال آج

قدرت کی یہ ہولی یہ سماں یاد رہے گا — عشرت کدۂ حسنِ جواں یاد رہے گا

شاخوں کے فضا میں ہیں پھریرے بھی نشاں بھی — پریاں ہیں سرِ دوش لئے تختِ رواں بھی

پھولوں کے دہکتے ہوئے رخسار تو دیکھو — جلوؤں کی ذرا گرمیِ بازار تو دیکھو

طالب کے لئے حاصلِ یک مشت یہی ہے — آتش کدۂ حضرتِ زرتشت یہی ہے

گو وادیِ ایمن سے یہ بن دور بہت ہے — موسیٰ کو بلاؤ کہ یہاں طور بہت ہے

ہے شہر بدخشاں تو بہت دُور یہاں سے — یہ لعل گراں آئے ہیں یہ عرش کہاں سے

غزل

زہے نباتِ لبی و خوشا شکر دہنی — وبالِ جاں ہے مگر آپ کی یہ کم سخنی

جو چاہے تیشہ اُٹھائے بشغلِ تیشہ زنی — ہر ایک شخص کا حصہ نہیں ہے کوہ کنی

ہر ایک دَور میں کبر و منی کے دم پہ بنی — وہی ہے آدمِ خاکی وہی ہے کبر و منی

زمانے بھر سے ہے نازک مرا خیالِ لطیف — مرے خیال سے نازک تمہاری گل بدنی

یہی ہے مطلعِ موزوں یہی ہے جانِ غزل — مری جمال طرازی تمہاری سیم تنی

جو ایک بار نظر پڑ بنی محبت میں | یہ کیا ستم ہے کہ دل پر ہزار بار بنی
نہ جانے کون سے عالم میں ہے مسافرِ عشق | نہ راہِ سخت کی دشواریاں نہ چھاؤں گھنی
یہ کیا ہوا کہ چمن کو لگا رہی ہے آگ | ہماری شعلہ نوائی گلوں کی شعلہ زنی
تضاد خانۂ عالم اسی کو کہتے ہیں | جھکی ہوئی وہ نگاہیں وہ شوخ پیرہنی
نہ جائے گا ترا افلاسِ ذہن اے انساں | جو تجھ کو مل بھی گئی دولتِ ہزار فنی
غنی جہاں کے ہیں محروم دل کی دولت سے | غنی وہی ہے حقیقت میں جو ہے دل کا غنی
خلش گری میں بھی رکھنی نہیں جواب اپنا | نزاکتوں سے گراں باران کی گُل بدنی
ہر ایک دل میں اگر بغض ہے تو پھر اے عرش | تمھارے واسطے لازم ہے سب کی دل شکنی

۸۸۔ اختر اورینوی

۱۹۱۱ء

اختر حسین ولد سید وزارت حسین موضع کاکو ضلع گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ مونگیر سے ۱۹۲۶ء میں میٹرک بدرجہ اول کامیاب ہوئے۔ میڈیکل کالج میں دو سال تعلیم پائی لیکن بوجہ علالت منقطع کرنا پڑا۔ ۱۹۳۶ء میں اردو ایم۔ اے فرسٹ کلاس میں پاس ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں لکچرار اردو مقرر ہوئے اب صدر شعبہ اردو ہیں تصنیف و تالیف و تحقیق کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ تقریباً ۱۲ کتابیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ نقد و نظر۔ تحقیق و تنقید۔ تنقید جدید۔ اور افسانوں کے متعدد مجموعے شامل ہیں۔ شعر و سخن کا بھی شروع ہی سے ذوق ہے۔

ابدی رات

سون کی شام دل آویز ہے گلنار ہنوز
سیم سیال کے نغمے بھی ہیں بیدار ہنوز

اب بھی پُروائی کی ساون میں لہک آتی ہے
اب بھی بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک آتی ہے

آم کے باغ پہ متوالی گھٹا چھاتی ہے
دھان کے کھیت کو انگڑائی چلی آتی ہے

اب بھی ندی کی لچکتی ہوئی باہیں ہیں وہی
اب بھی باغوں میں مچلتی ہوئی راہیں ہیں وہی

سرسراتی ہوئی شاخوں میں ہوا ہے چنچل
لچلچاتا ہوا وادی پہ ہے دھانی مخمل

کوک کوئل کی ہے بے تاب تمنا اب تک
رقص بسمل کی ہے اِک ہوک پپیہا اب تک

تاڑ کی اوٹ میں خنداں ہے ابھی تک مہتاب
اب بھی شیشم کی قطاروں پہ ہے شبنم سیماب

اب بھی پتوں میں ہے کرنوں کی وہ جھل مل باقی
سروِ شاداب چمن میں ہے مثالِ ساقی

نقرئی جام ہے بیلا تو ہے چمپا زرفام
پھول کا نشّہ ہے لغزیدہ گلستاں میں تمام

جال بنتے ہوئے سائے ہیں کہ ہے موجِ خمار
فرشِ گلشن پہ ہے بکھری ہوئی چاندی کی بہار

چاندنی کھیلتی ہے ریت کے ٹیلوں پہ ہنوز
بانسری بجتی ہے گھلتی ہے فضائے پُرسوز

پھر بھی منظر میں کمی سی یہ کھٹکتی کیوں ہے
شوقِ حیراں کی نگہ آج بھٹکتی کیوں ہے

اب بھی ہیں زہرہ وشانِ دشمنِ ایماں اب بھی
اب بھی زنجیر خرد کاکُلِ پیچاں اب بھی

اب بھی بیتاب ہے دامانِ تمنا اب بھی
اب بھی بے خواب ہے یہ چشمِ تماشا اب بھی

سب سہی پر وہ محبت کی نظر ہے خاموش
دل تو ویراں ہے بلا سے ہو گلستاں گل پوش

چاندنی رات جگاتی ہی رہے گی جادو
اپنی برسات کی چمکائے گی سیمیں گھنگرو

جب بہار آئے گی کلیوں کو نکھار آئے گی
شام گلبار شفق کو بھی سنوار آئے گی

پر خزاں دیدہ تمنّا کی نہیں کوئی بہار
پھول اُلفت کے جو مُرجھائے تو پھر خار ہی خار

دل کی تاریک خموشی ابدی رات کا سوز
مرگِ بے حشر محبت کی ہے ہچکیاں دل دوز

کارواں عشرتِ فردا کا ہوا بھی اوجھل
دامنِ گرد کو پکڑے ہوئے کیوں ہے بے کل

تیز رفتار زمانہ مرے دل دور گیا
اپنے بے درد قدم سے مجھے بس چور گیا

سون کی شام مگر دیکھ ہے گُلنار ہنوز

غمِ نارسائی

شبِ فراق کٹی ہاں نمودِ صبح ہوئی
نویدِ وصل مگر آفتاب دے نہ سکا

زمانہ بدلا نئے ساز کو ملا سنگیت
دلِ شکستہ کو میرے رباب دے نہ سکا

یہ مانا ساقیِ نوخیز نے لُٹائی مے
طلب تھی جس کی مجھے وہ شراب دے نہ سکا

عروسِ دہر نے لی گو جوان انگڑائی
پیامِ دردِ محبت شباب دے نہ سکا

دماغ کو نئی کرنوں کی جھلملاہٹ دی
شعورِ قلب و نظر انقلاب دے نہ سکا

نظامِ نو نے سجایا ہے ایک گُلدستہ
شکستِ گل کا مگر وہ حساب دے نہ سکا

نکھارا تازہ بہاروں کی مستیوں نے اسے
دلِ حزیں مرا اب تک جواب دے نہ سکا

یہ آرزو تھی کہ دوں سوزِ قلب عالم کو
وفا میں جاں بھی یہ خانہ خراب دے نہ سکا

تمھاری بزم میں جمہوریت تماشائی
یہاں یہ غم کہ وفا کی نہیں پذیرائی

۸۹۔ فیض احمد فیضؔ

۱۹۱۱ء

گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں اور ۱۹۳۴ء میں عربی میں ایم۔ اے کے امتحان کامیاب کیے اور ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہوئے۔ سیاسی تحریکات کی بنا پر وہاں عرصے تک قید رہے۔ نقشِ فریادی۔ دستِ صبا اور نقوشِ زنداں کلام کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔

دو آوازیں

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شب خوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں اُلجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نبٹا لیں گے
یہ تیرا کفن وہ میرا کفن یہ میری لحد وہ تیری ہے

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری

اِس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

یہ بزم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا

افسردہ ہیں گر ایام ترے بدلا نہیں مسلک شام و سحر

ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم قائم ہے جمالِ شمس و قمر

آباد ہے وادیٔ کاکل و لب شاداب و حسیں گلگشتِ نظر

مقسوم ہے لذّت دردِ جگر موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر

اس دیدۂ تر کا شکر کرو اس ذوقِ نظر کا شکر کرو

اس شام و سحر کا شکر کرو ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلک شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا

رعنائیٔ شب کا کیا ہوگا اندازِ سحر کا کیا ہوگا

جب خونِ جگر برفاب بنا جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا

جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں

یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے اس کلکِ گہر کا کیا ہوگا

جب کنجِ قفس مسکن ٹھیرا اور جیب و گریباں طوق و رسن

آئے کہ نہ آئے موسمِ گُل اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک

اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک

ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے

وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبل قیصر و کے

آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمت کا

اک عمر ہے اپنی ہر ساعت اِمروز ہے اپنا ہر فردا

یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں

یہ لوح و قلم یہ طبل و علم یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جُنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

اک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یوں ہی دم بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یوں ہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

۹۰۔ روشؔ صدیقی

۱۹۱۱ء

شاہد عزیز ولد طفیل احمد شاہد جوالاپور (سہارنپور) کے رہنے والے ہیں۔ شعر و سخن میں اپنے والد سے رہبری حاصل کی اور ۱۹۲۴ء تک غزلیں لکھیں۔ اس کے بعد سے نظم نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ اردو کے ہم عصر شعرا میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ مجموعۂ کلام محرابِ غزل چھپ چکا ہے۔

اب عالمِ تغافلِ پنہاں پہ کچھ اور ہے
ہر لمحہ اضطراب کا عنواں کچھ اور ہے

ہے یوں تو ہر نشاط فدا موسِ عاشقاں
لیکن اشارۂ غمِ جاناں کچھ اور ہے

یہ داستاں نہیں رخ و گیسو پہ منحصر
افسانۂ جمال کا عنواں کچھ اور ہے

ہر چند جامِ مرگ بھی ہے راحت آفریں
اے دردِ زندگی ترا درماں کچھ اور ہے

الطاف برملا کی تو کیا بات ہے مگر
رعنائیِ نوازشِ پنہاں کچھ اور ہے

بیتابیٔ خرد ہے نہ بیبا کیٔ جنوں — اے دوست رازِ چاکِ گریباں کچھ اور ہے

زاہد ترا نشیمنِ ایماں بھی ہے بلند — لیکن مرا تصورِ ایماں کچھ اور ہے

برحق مسرتِ سروساماں مگر روشؔ — لطفِ حیات بے سروساماں کچھ اور ہے

چشمۂ شاہی سری نگر کشمیر

کس نے جھانکا ہی شفق رنگ جھروکے سے مجھے

صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید

زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے

آگہی حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے

کیوں یہ پیشانیٔ احساس جھکی جاتی ہے

حیرتِ عالمِ امکاں کو خبر ہو شاید

کس کے آنچل کی جھلک تھی یہ کوئی راز نہیں

کیا یہ روپوشیِ انداز ہی غماز نہیں

شوق کو پردۂ غفلت نہ بنا اے محبوب

اس رہ و رسم قدامت کو اٹھا اے محبوب

نہ محبت کو محبت سے چھپا اے محبوب

عشق مدہوش سہی غافلِ آغاز نہیں

کچھ خبر ہے تجھے اے محوِ حجاب آرائی

اب کہاں ہے مری آوارگی و رسوائی

ہر طرح اب دلِ محرومِ سکوں ہے رُسوا
ہر خموشی سے جُدائی کا فسوں ہے رُسوا
عشق حیران ہے خود چپ ہے جنوں ہے رُسوا
زندگی ہے کہ کوئی قافلۂ تنہائی

تھک کے بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر تیرے لئے
بن گیا گردِ رُخِ شام و سحر تیرے لئے
میں ترا خواب ہوں آنکھوں میں بسا لے مجھ کو
میں ترا درد ہوں سینے سے لگا لے مجھ کو
میں ترا عکس ہوں دامن میں چھپا لے مجھ کو
میں تو صدیوں سے ہوں سرگرمِ سفر تیرے لئے

آرزو کیا غم و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
درد کیا تلخ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک مایوسیٔ پیہم ہے عناں گیرِ وفا
خود بخود ٹوٹ نہ جائے کہیں زنجیرِ وفا
دور جاتے ہوئے کچھ خواب ہیں تعبیرِ وفا
جیسے کونین میں فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں

شعلۂ زیست ہے محرومِ تپش میرے لئے
مرگ و ہستی میں نہیں کوئی کشش میرے لئے
شہد کی طرح بہت زہر پیا ہے میں نے

غمِ پنہاں کو بہت پیار کیا ہے میں نے

داغِ دامن پہ نہیں دل پہ لیا ہے میں نے

جیسے دُنیا میں تھی ہر ایک خلش میرے لئے

انقلابات سے ہم دوش رہا ہوں برسوں

خالقِ تمکنتِ ہوش رہا ہوں برسوں

سی دیا ہے کبھی انجم کے گریبانوں کو

کبھی چھیڑا ہے گرجتے ہوئے طوفانوں کو

کردیا خواب کبھی دہر کے افسانوں کو

خرد افروز و جنوں کوش رہا ہوں برسوں

کردیا چاک نقابِ رُخِ آلام کبھی

صبحِ امکاں کو کیا منتظرِ شام کبھی

مگر احساسِ جُدائی کو جُدا کر نہ سکا

وقت کو دامِ تعیّن سے رِہا کر نہ سکا

دہر پھر بھی مجھے بیزارِ وفا کر نہ سکا

تجھے بھولا نہیں میرا دلِ ناکام کبھی

یہ مری روح ہے یا حسرتِ نظارہ ہے

دل مرا اِک ابدی شوق کا گہوارہ ہے

کہیں ہو جائے نہ پامال طلب عشق مرا

بھول جائے نہ کہیں راہِ ادب عشق مرا

خود فراموش ہوا جاتا ہے اب عشق مرا
ہر نفس تشنہ و وارفتہ و آوارہ ہے

کیا تری آنکھ بھی میرے لئے بے خواب نہیں
نرگسِ ناز میں بھی شبنمِ شاداب نہیں

کیا وہی عالمِ فردائے وفا ہے اب بھی
کیا وہی انجمنِ ہجر نما ہے اب بھی
کششِ دل کششِ دل سے خفا ہے اب بھی

تو بھی کیا اپنی روشؔ کے لئے بیتاب نہیں

ختم یہ کشمکشِ وہم و گماں کب ہوگی
دُور یہ ظلمتِ شبہائے خزاں کب ہوگی

کیا کوئی دورِ حجابات ابھی باقی ہے
کوئی امکانِ محالات ابھی باقی ہے
کیا جدائی کی کوئی رات ابھی باقی ہے

زندگی کی ابدی صبح عیاں کب ہوگی

آکہ اب شمعِ جدائی کو بجھا دیں اے دوست
یہ جو اک پردہ آخر ہے اٹھا دیں اے دوست

کھو نہ جائیں کہیں طغیانِ فراموشی میں
غم کہیں ڈھونڈ نہ لے وادیٔ خاموشی میں
پھینک دیں روح کو فردوس ہم آغوشی میں

زندگی کو ابدی خواب بنادیں اے دوست

۹۱۔ شاہد صدّیقی

۱۹۱۱ء

آگرے میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے حیدر آباد میں قیام ہے۔ مختلف اخبارات میں کام کیا۔ اب خود ایک ہفتہ وار 'جمہور' نکالتے ہیں۔ نواب معظم جاہ کے برسوں ندیم رہے۔ لاابالی طبیعت اور قلندر مزاجی کے باعث کوئی مجموعہ نہ چھپوا سکے۔ اب انجمن ترقی اردو شاخ حیدر آباد کی طرف سے ایک مجموعہ زیر اشاعت ہے۔

غزلیں

یہ کیا ستم ہے کہ احساسِ درد بھی کم ہے
شبِ فراق ستاروں میں روشنی کم ہے

یہ کیسی موجِ کرم تھی نگاہِ ساقی میں
کہ اس کے بعد سے طوفانِ تشنگی کم ہے

قریب و دُور سے آتی ہے آپ کی آواز
کبھی بہت ہے غمِ جُستجو کبھی کم ہے

شعورِ عشق اب آیا ہے اپنی منزل پر
حضورِ حسن تمنّائے بے خودی کم ہے

تمام عمر ترا انتظار کرلیں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے

عروجِ ماہ کو انساں سمجھ گیا لیکن
ہنوز عظمتِ انساں سے آگہی کم ہے

نہ تھے بہارِ چمن ہم مگر یہ سُنتے ہیں
ہمارے بعد گلوں میں شگفتگی کم ہے

نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

مستیوں کے دامن میں انقلاب پلتے ہیں
میکشوں کی لغزش سے میکدے سنبھلتے ہیں

کیوں ہمارے ساتھ ایسے سُست گام چلتے ہیں
جو سفر سے گھبرا کے راستے بدلتے ہیں

ایک پل کے رُکنے سے دُور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

زندگی کو ڈھلنا ہے آج ان کے سانچوں میں
زندگی کی گرمی سے جن کے دل پگھلتے ہیں

کیا ہوا جو ساکن ہے آج سطح دریا کی
تہ میں کتنے ہی طوفاں کروٹیں بدلتے ہیں

قافلے اندھیرے میں خود ہی راستے ڈھونڈیں
رہنما تو ایسے ہیں دُور دُور چلتے ہیں

دیکھئے کہاں پہنچیں یہ سفر کے دیوانے
آسماں کو تکتے ہیں اور زمیں پہ چلتے ہیں

۹۲ - آلِ احمد سُرور

۱۹۱۲ء

بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے مطالعے کا شوق رہا۔ ۱۹۲۸ء میں ہائی اسکول سے فراغت پائی۔ ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ۱۹۳۶ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا اور علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی سے شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرار منتقل ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں پہلا مجموعۂ کلام سلسبیل شایع ہوا۔ اس کے بعد نثر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب تک متعدد تنقیدی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ مگر شاعری ترک نہیں کی۔ ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی میں اردو کے ریڈر ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں استعفا دے دیا۔ اب علی گڑھ میں اردو کے سرسری پروفیسر اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں دوسرا مجموعۂ ذوقِ جنوں شایع کیا۔

عزم کوہ کنی

یہ سوچتے تھے چمن میں بہار آتے ہی
ہمارے پھولوں سے مہکیں گے بام و در کتنے

ہماری ناؤں پہ چھوئیں گے کتنے دل والے
ہمارے قدموں سے جاگیں گے رہ گزر کتنے

لہو دیا ہے ہر اک نوکِ خار کو، ہم نے
خزاں کے دَور میں پوجا بہار کو ہم نے

جو زعمِ حسن میں اہلِ وفا کو بھول گیا
سکھائے ناز و ادا اس نگار کو ہم نے

عروسِ وادیِ گنگ و جمن کی زلفوں کو
دیئے ہیں کتنے دل آویز پیچ و خم ہم نے

طلوعِ مہر کی خاطر سیاہ راتوں میں
ستارے کتنے لٹائے ہیں بیش و کم ہم نے

نمازِ شاہ و گدا شیخ و برہمن کا گداز
سرشکِ چشمِ وفا سرگزشتِ زلفِ دراز

ہر ایک عارف و عامی کے قلب کی دھڑکن
بہارِ شاہدِ معنی دکانِ آئینہ ساز

مورّخ اپنے ہی زرّیں ورق کو بھول گئے
معلّم آج کے کل کے سبق کو بھول گئے

جو اس کے نام کی مالا جپا ہی کرتے تھے
حکومت آئی تو اردو کے حق کو بھول گئے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
غرورِ عشرتِ پرویز و عزمِ کوہ کنی

چراغِ اہلِ محبت کب آندھیوں سے بجا
جنوں کو راس ہی آئی خرد کی خندہ زنی

وہ موجِ نور نہیں ہے فریبِ ظلمت ہے
جو اپنے جلوۂ صد رنگ کو غبار کہے

سنو نہ اہلِ چمن لاکھ باغباں کوئی
روش کو سبزۂ بیگانہ گل کو خار کہے

یہ قہر کون سہے گا کہ اپنی محفل میں
ہجومِ شوق نہ ہو لطفِ داستاں نہ رہے

دلوں میں ساغرِ سرشار کا فسانہ نہ ہو
لبوں پہ غالبؔ و اقبالؔ کی زباں نہ رہے

اُبھرنے دو ابھی موجوں کا سازِ زیرِ لبی
یہ نقشِ عشرتِ ساحل مٹا ہی دیتا ہے

بلا سے ریت میں ہوتا ہے جذب ہونے دو　　کہ قطرہ قطرہ لہو گل کھلا ہی دیتا ہے۔

غزل

ہر اک جنّت کے رستے ہو کے دوزخ سے نکلتے ہیں
انھیں کا حق ہے پھولوں پر جو انگاروں پہ چلتے ہیں

حقائق ان سے ٹکرا کر نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں
بڑے ہی سخت جاں ہوتے ہیں جو خوابوں پہ پلتے ہیں

گماں ہوتا ہے جن موجوں پہ اک نقشِ حبابی کا
انھیں سوئی ہوئی موجوں میں کچھ طوفان پلتے ہیں

وہ رات آخر ہوئی تو کیا یہ دن کب رہنے والا ہے
ستارے ماند ہوتے ہیں اگر سورج بھی ڈھلتے ہیں

تمھاری مصلحت اچھی کہ اپنا یہ جنوں بہتر
سنبھل کر گرنے والو ہم تو گر گر کر سنبھلتے ہیں

تلوّن چشمِ ساقی میں تغیّر وضعِ رندی میں
ہمارے میکدے میں روز پیمانے بدلتے ہیں

اندھیرا ہی اندھیرا ہے مری تاریک راہوں میں
مجھے کیا ان چراغوں سے جو ایوانوں میں جلتے ہیں

کبھی بے وجہ رنجش ہے کبھی بے سود کاہش ہے
وہی ہے شوق لیکن ہر گھڑی عنواں بدلتے ہیں

حقائق سرد ہو سکتے ہیں سب محراب و ممبر کے
مگر وہ خواب، جو رندوں کے پیمانے میں ڈھلتے ہیں

جنوں نے عالمِ وحشت میں جو راہیں نکالی ہیں
خرد کے کارواں آخر انھیں راہوں پہ چلتے ہیں

سرورِ سادہ کو، یوں تو لہو رونا ہی آتا ہے
مگر اس سادگی میں بھی، بڑے پہلو نکلتے ہیں

۹۳۔ احمد مجتبیٰ وامق جونپوری

۱۹۱۲ء

جونپور میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۷ء میں بی اے ایل ایل بی کامیاب کیا۔ فیض آباد میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں بنارس میں راشننگ افسر مقرر ہوئے۔ اب مسلم یونیورسٹی میں انجینیرنگ کالج کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ ۱۹۴۰ء سے شاعری شروع کی۔ دو مجموعے چیخیں اور جرس چھپ چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ بھی تیار ہے۔ عہد حاضر کے ایک مقبول اور مشہور شاعر ہیں اور پڑھنے کا انداز بھی بہت مقبول ہے۔

سرخ دامن میں شفق کے کوئی تارا تو نہیں
ہم کو مستقبلِ زرّیں نے پکارا تو نہیں

دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں

آکے پھر لوٹ چلی کشتیٔ دل ساحل سے
پھر کسی موجۂ طوفاں نے پکارا تو نہیں

اس غمِ دوست نے کیا کچھ نہ ستم ڈھائے مگر
غمِ دوراں کی طرح جان سے مارا تو نہیں

اشک جو دے نہ اٹھے تو سرِ مژگاں آکر
صرف اک قطرۂ شبنم ہے شرارا تو نہیں

ہاتھ میں جام لئے کب سے اسی سوچ میں ہوں
میں ہی تنہا اسے پی لوں یہ گوارا تو نہیں

اِک اُجالا سا جھلکتا ہے پسِ پردۂ شب
چشمِ بے خواب میں لرزاں کوئی تارا تو نہیں

دُور مشرق میں جو روشن ہیں کئی انگارے
اپنی قسمت کا کوئی اِن میں ستارا تو نہیں

کتنی امیدوں پہ جیتا رہا وامقؔ اب تک
اب مگر اک یہی جینے کا سہارا تو نہیں

ہماری رِندی مجاہدانہ خیالِ توبہ بھی ہو تو کیسے
ابھی تو ہم کو نہ جانے کتنے ہی کام لینے ہیں جام و مے سے

ابھی تو ساقی سے چل رہی ہے ابھی بھلا ذکرِ محتسب کیا
ابھی تو ہم میکدے میں بیٹھے ہیں یوں کہ خود محتسب ہوں جیسے

نہ دل میں واعظ کا خوف باقی نہ سر میں توبہ کا ہوش باقی
وہاں تلک میکدے کی حد ہے جہاں تلک پاس ہوں نہ پیسے

یہ تیری جادو نوائی اور نغمگی سلامت رہے ہمیشہ
ترانۂ وقت گا رہا ہے تو گانے والے عجیب لَے سے

ہماری طرزِ نوا سے وامقؔ مذاقِ محفل کچھ ایسا بدلا
کہ آرہا ہے نظر ہر اک نَے نواز بازطن خود اپنی نَے سے

مرے حوصلوں کو نئی فضا نئے بال و پر کی تلاش ہے
مرے گلستاں کو نئے نظامِ گل و شجر کی تلاش ہے

مجھے اس جنوں کی ہے جستجو جو چمن کو بخش دے رنگ و بو

جو نوید فصلِ بہار ہو مجھے اس نظر کی تلاش ہے

مجھے اس سحر کی ہو کیا خوشی جو ہو ظلمتوں میں گھری ہوئی

مری شامِ غم کو جو لوٹ لے مجھے اس سحر کی تلاش ہے

یوں تو کہنے کے لئے چارہ گر مجھے بے شمار ملے مگر

جو مزاجِ درد سمجھ سکے اسی چارہ گر کی تلاش ہے

مری زندگی وہ بنائے کیا مجھے راستہ وہ دکھائے کیا

جسے خود ہی اپنی نمود کے لئے میرے سر کی تلاش ہے

مرے ناصحا مرے نکتہ چیں تجھے میرے دل کی خبر نہیں

میں حریف جذبۂ بندگی تجھے سنگِ در کی تلاش ہے

مجھے عشق حسن و حیات سے مجھے ربط فکر و نشاط سے

مرا شعر نغمۂ زندگی تجھے نوحہ گر کی تلاش ہے

اسے ضد کہ وامق پردہ در کسی راز سے نہ ہو باخبر

مجھے ناز ہے کہ یہ دیدہ ور مری عمر بھر کی تلاش ہے

۹۴۔ معین احسن جذبیؔ

۱۹۱۲ء

اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ جھانسی، لکھنؤ، آگرہ اور دہلی میں تعلیم حاصل

کی۔ ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد تلاش ملازمت کے سلسلے میں

برسوں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرتے رہے۔ بچپن سے شاعری
کی لگن ہے۔ پہلے غزلیں کہتے تھے بعد کو نظمیں لکھنے لگے۔ ممتاز ترقی پسند
شعرا میں سے ہیں۔ آج کل علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ملازم ہیں۔ مجموعۂ کلام
فروزاں شایع ہو چکا ہے۔

مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنّا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا اب خواہشِ دُنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنّا کِس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے

وعدے کی وفا تم سے نہ ہوئی گو جان پہ میرے بن ہی گئی
گر جھوٹا ہوں جھوٹا ہی سہی اب تم کو جھوٹا کون کرے

ہاں وادیِ ایمن بھی ہے وہی ہاں برق کا مسکن بھی ہے وہی
اور ہوش کا خرمن بھی ہے وہی پر اُن سے تقاضا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بُجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبیؔ ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دُنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دُنیا دُنیا کون کرے

موت

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگالوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اِک دھوم مچالوں تو چلوں

اور اک جام مئے تلخ چڑھاؤں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

وہ مرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں
مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
آنسوؤ تم نے تو بے کار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں
ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیِٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلّقات کا ہو جس سے احتمال
بیباکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرّت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ، بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جُرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبّت کی آرزو
پر ایسی اِک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چُرانے کی عادت کہاں سے لائیں

۹۵۔ اسرار الحق مجازؔ

۱۹۱۳ء-۱۹۵۵ء

ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اور آگرے میں تعلیم پائی۔ پھر علی گڑھ گئے اور وہیں سے بی۔ اے کیا۔ دلّی میں ملازمت کی تھی لیکن چار سال بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ شاعری علی گڑھ ہی میں چمکی اور دہلی کی صحبتوں میں رعنائی کلام جلوہ گر ہوئی۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔ سازِ نو اور آہنگ کلام کے مطبوعہ مجموعے ہیں۔

غزل

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسّم پا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اِک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگ بہار عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا

اِک نہ اِک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی

آسمانوں سے فرشتے بھی اُترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

ابنِ مریم بھی اُٹھے موسیٔ عمراں بھی اُٹھے
رام و گوتم بھی اُٹھے فرعون و ہاماں بھی اُٹھے

اہلِ سیف اُٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب اُٹھتے رہے اور آں جناب آتے رہے

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی

مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منّت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اِک نہ اِک در پر جبینِ شوق گھِستی ہی رہی
آدمیّت ظلم کی چکّی میں پِستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

۹۶۔ سکندر علی وجد

۱۹۱۴ء

سکندر علی وجد ۱۹۱۴ء میں ویجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی اور یہیں ۱۹۳۰ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں کالج کے میگزین "نورس" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۳۶ء میں "مجلہ عثمانیہ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سول سروس کا امتحان پاس کیا۔ اسی زمانے میں وجد کی شاعری مشاعروں اور ادبی حلقوں میں پہنچی، اور پسند کی گئی۔ وجد کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" ۱۹۴۴ء میں اور دوسرا مجموعہ "آفتابِ تازہ" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے وجد کا منتخب کلام ۱۹۵۴ء میں شائع کیا۔ (۲۸) سالہ شاعری کا ایک مکمل مجموعہ "دولتِ بیدار" زیرِ طبع ہے۔ وجد آج کل ضلع ناندیڑ (بمبئی اسٹیٹ) کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج ہیں۔ وجد کی طویل نظم "کاروانِ زندگی" عنقریب کتابی شکل میں شائع ہونے والی ہے۔

تاج محل

اے بارگاہِ حسن ترا فیض عام ہے — دریائے مہر و لطف رواں صبح و شام ہے

تو رشتۂ وفا کا سہانا پیام ہے — فانی زمیں پہ نقشِ بقائے دوام ہے

جادو نگاہِ عشق کا پتھر پہ چل گیا
الفت کا خواب قالبِ مرمر میں ڈھل گیا

گلریز رنگِ خونِ دلِ حسن کار ہے
اس باغِ بے خزاں میں ہمیشہ بہار ہے

پانی پہ عکس، قلب صفت بے قرار ہے
جمنا ترے شباب کی آئینہ دار ہے

ہیبت سے تیری دلکشیٔ بے پناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

یہ زرد و نرم دھوپ، یہ پُرکیف وقتِ شام
کندن بنے ہوئے در و دیوار و سقف و بام

خورشید کر رہا ہے تجھے آخری سلام
وہ قلبِ شرق چیر کے نکلا مہِ تمام

جوں ہی رواں سفینۂ مہتاب ہو گیا
تو موج خیز قلزمِ سیماب ہو گیا

بہزادِ عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ
منظر کشِ بہارِ چمن ہے، جبینِ سنگ

کلیوں کا وہ نکھار، وہ گلہائے رنگ رنگ
فانوسِ شمعِ کشتہ ہے لپٹے ہوئے پتنگ

رنگینیاں ہیں جوہرِ اہلِ کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

تو نقشِ آرزو ہے مجسّم زمین پر
آنکھوں نے تیرے حسن کی مے پی ہے اس قدر

اک سرخوشی ہے قلب میں، سرشار ہے نظر
بیٹھا ہوں پائے وقت کی آہٹ سے بے خبر

ارزاں قدم قدم پہ سکونِ حیات ہے
تیری حریمِ ناز میں دن ہے نہ رات ہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہُنر برسوں
جہاں گھُلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنّتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

تجلّی زارِ عرفاں شاہکارِ ابنِ آدم ہے
سرِ فطرت، عمل کی بارگاہِ حُسن میں خم ہے

تمدن منعکس ہو جس میں ایسا ساغرِ جم ہے
جمالِ زندگی رہنِ جلالِ عزمِ گوتم ہے

اُمیدِ جانِ تازہ پھر دلِ بسمل میں آئی تھی
تلاشِ امن میں تہذیب اِس منزل میں آئی تھی

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی
تصدّق جن کے ہر خط پر تحیّر خانۂ مانی

مشکّل ہے شباب و حُسن میں تخئیلِ انسانی
تقدّس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عُریانی

حسینانِ اجنتا کا جُنوں سرتاج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

گلستاں سے جو گزرا کارواں فصلِ بہاری کا
بہانہ مل گیا اہلِ جنوں کو حُسن کاری کا

چٹانوں پر بنایا نقشِ دل کی بے قراری کا سکھایا گر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی

جگرداروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

کہیں پیدا ہی ساری کیفیت صحنِ گلستاں کی کہیں رونق نظر آتی ہے بازار و شبستاں کی

کہیں حیرت زبانِ حال ہے حالِ پریشاں کی لکیریں ہیں کہ شریانیں دلِ انسان و حیواں کی

کہیں ظلمت کے پیچھے روشنی محسوس ہوتی ہے

کہیں تو موت میں بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

ہُنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے تراز دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی، ہی

اداؤں سے عیاں ہے لذّتِ دردِ جگر دی ہے کھُلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مُہر کر دی ہی

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں

مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ اربابِ ہمم کی سعیٔ پیہم کا جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا

دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں

فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

حریمِ کعبۂ فن معبدِ نازک خیالاں ہے جہانِ نور و نکہت مسکنِ آشفتہ حالاں ہے

جنوں افشاں فضا میں مستیٔ چشمِ غزالاں ہے لبِ جوئے کہستاں جلوہ گاہِ خوش جمالاں ہے

ملا ہے زندگی کو بانکپن اِن کج کلاہوں سے

نظر والوں پہ شمشیریں برستی ہیں نگاہوں سے

حریفِ نغمۂ جاں بخش یہ خاموش گویائی
کمالِ فکر و فن، حُسنِ تناسب، شانِ زیبائی

حقیقت بن گئی جذبات کی صد رنگ رعنائی
لبوں پر ضَوفگن ہے نورِ اعجازِ مسیحائی

نگاہوں میں عجب انداز ہے خارا گدازی کا
دلوں پر نقش رہ جاتا ہے جن کی بے نیازی کا

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر
خوشامد اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر

نہ چھانی خاک دردر کی کسی انعام کی خاطر
جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر نقش چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

غزل

خوش جمالوں کی یاد آتی ہے
بے مثالوں کی یاد آتی ہے

باعثِ رشکِ مہر و ماہ تھے جو
اُن ہلالوں کی یاد آتی ہے

جن سے دُنیائے دل منوّر تھی
اُن اُجالوں کی یاد آتی ہے

جن کی آنکھوں میں تھا سرورِ غزل
اُن غزالوں کی یاد آتی ہے

سادگی لاجواب ہے جن کی
اُن سوالوں کی یاد آتی ہے

ذکر سنتے ہی نوجوانی کا
کچھ خیالوں کی یاد آتی ہے

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

وجدؔ لطفِ سخن مبارک ہو
باکمالوں کی یاد آتی ہے

۹۷۔ علی سردار جعفری

۱۹۱۳ء

لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ترقی پسند شاعری اور ادب کے علم بردار ہیں۔ روس کی سیاحت کی۔ آج کل بمبئی میں فلمی گانے لکھنے کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ کلام کے مجموعے۔ خون کی لکیر۔ منزل۔ نئی دُنیا کو سلام اور ایشیا جاگ اٹھا چھپ چکے ہیں۔ ان کی شہرت ہندستان سے باہر بھی دُور دُور تک پہنچ چکی ہے اور کلام کے ترجمے کئی زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ ترقی پسند ادب پر ایک کتاب بھی شایع کی ہے۔

خون کی لکیر

پھر شمیمِ گل نویدِ جاں فزا لائی ہے آج
میرے گلشن میں بہارِ رفتہ پھر آئی ہے آج

پھر اُٹھا ہے وادیِ گنگا سے ابرِ نو بہار
سمتِ راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج

آج پھر ہے اتحادِ شیشہ و ساغر کا دَور
محفلِ رنداں میں جشنِ بادہ پیمائی ہے آج

چشمِ ساقی تجھ پہ سارا میکدہ آباد ہے
قامتِ رعنا میں موجِ مے کی انگڑائی ہے آج

کھل گئے ہیں اشتیاقِ دیدہ میں آنکھوں کے در
دوستوں کی خانۂ دل میں پذیرائی ہے آج

"آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک"
شور ہے محفل میں دیوانوں کی بن آئی ہے آج

پھر وہی گلیاں وہی اگلا طوافِ کوئے دوست
عشق کو مژدہ کہ پھر سامانِ رسوائی ہے آج

کون ہے کس سے سنبھالا جائے گا میرا جنوں
خود ہی پائے شوق کو زنجیر پہنائی ہے آج

ڈر رہا ہوں جان و تن کو پھونک ڈالے گی یہ آگ
میرے سینے میں جو ضبطِ غم نے بھڑکائی ہے آج

آج بے باکی میں ہے اہلِ خرد کی مصلحت
سر فروشی ہی میں اہلِ دل کی دانائی ہے آج

مسکرائے زخمِ دل ہنسنے لگے سینے کے داغ
روحِ استبداد کیسی کیسی شرمائی ہے آج

خونِ ناحق لالہ و گل بن کے پھوٹا خاک سے
تیشہ زن کے خوں سے دشت و در کی زیبائی ہے آج

کہہ دو صیادوں سے گلچینوں کو کر دو ہوشیار
فصلِ گل نے دور تک زنجیر پھیلائی ہے آج

ہاں یہی ہے روزِ محشر ہاں یہی روزِ حساب
تیری رسوائی ہے اب یا میری رسوائی ہے آج

پھر ہی میناروں پہ عشرہ پھر ہیں گنبد سرنگوں
پھر نوا شاعر کی ایوانوں سے ٹکرائی ہے آج

آج پھر قدموں پہ میرے جھک رہی ہے کائنات
میرے قبضے میں جہانِ نو کی دارائی ہے آج

خاک پر جھکتی نہیں افلاک پر رکتی نہیں
جو نگہہ تقدیرِ عالم کی تماشائی ہے آج

ایک ساحل ہے جو ابھرا ہے بھنور کی گود سے
ایک کشتی ہے کہ طوفانوں سے ٹکرائی ہے آج

رنگ مے حسنِ نگاراں جشنِ گل فصلِ بہار
ہند کی روحِ جواں شعروں میں کھنچ آئی ہے آج

جل اٹھا نبضوں میں خوں روشن ہوئے دل میں چراغ
شاعرِ آتش نوا نے آگ برسائی ہے آج

۹۸۔ احسان دانش

۱۹۱۴ء

احسان الحق ولد قاضی دانش علی کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ اصلی وطن باغ پت ضلع میرٹھ ہے۔ والد ان کی پیدائش کے بعد غریب ہو گئے اور ان کو ان کے ساتھ ابتدا میں مزدوری کرنی پڑی۔ تعلیم ترک کر کے میونسپلٹی کے چپراسی بن گئے۔ افسروں کے بے جا سلوک کی

بنا پر ملازمت ترک کر کے لاہور پہنچے۔ اور مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ جتنا وقت ملتا مطالعے میں صرف کرتے۔ آخر کار گیلانی بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ اردو کے پہلے مزدور شاعر ہیں۔ اب اپنا ذاتی مکتبۂ دانش قائم کر لیا ہے۔ کئی مجموعے شایع ہوئے۔ نوائے کارگر۔ آتشِ خاموش۔ نفیرِ فطرت۔ چراغاں۔ جادۂ نو وغیرہ۔ نظمیں اور غزلیں سب ہی لکھی ہیں۔

رعنائیٔ کونین سے بیزار ہمیں تھے
ہم تھے ترے جلوؤں کے طلب گار ہمیں تھے

پتھر کبھی گلیوں پہ برستے تھے ہمیں پر
دیوانۂ گرِ کوچۂ و بازار ہمیں تھے

ہے فرق طلب گار و پرستار میں اے دوست
دنیا تھی طلب گار پرستار ہمیں تھے

اس بندہ نوازی کے تصدق سرِ محشر
گویا تری رحمت کے سزاوار ہمیں تھے

دے دے کے نگاہوں کو تصور کا سہارا
راتوں کو ترے واسطے بیدار ہمیں تھے

پچھتاؤ گے دیکھو ہمیں بیگانہ سمجھ کر
مانو گے کسی وقت کہ غم خوار ہمیں تھے

بازارِ ازل یوں تو بہت گرم تھا لیکن
لے دے کے محبت کے خریدار ہمیں تھے

ہاں آپ کو دیکھا تھا محبت سے ہمیں نے
جی سارے زمانے کے گنہگار ہمیں تھے

احسان ہے بے سود گلہ اُن کی جفا کا
چاہا تھا انھیں ہم نے خطاوار ہمیں تھے

سادھو کی چِتا

ہمنشیں کشمیر سے لاہور کو آتے ہوئے
اِک سماں دیکھا جگر پر نیشِ غم کھاتے ہوئے

گِر چکا تھا طاقِ مغرب سے چراغِ آفتاب
بند تھی مُجرِ دانِ تاریکی میں فطرت کی کتاب

ظلمتیں گردوں کی کالی جھیل سے چھلکی ہوئی
جھکڑوں سے ٹہنیوں کی گردنیں ڈھلکی ہوئی

لحظہ لحظہ تیرہ تر ہوتی فضائے سُرمگیں — سنگ پاروں پر اُچھلتی بوندیاں گیلی زمیں

ابر کے دامن میں کوندے کی لپک چشموں کا شور — ہلکی ہلکی بوندیوں کا سلسلہ جھرنوں کا زور

دُور وادی میں کہیں مدّھم سا دہقانوں کا غُل — تیز نالے پر گزرنے کے لئے لکڑی کا پل

پُل کی اک دیوار کے نیچے قریبِ رہ گزر — ایک سادھو کی چِتا تصویرِ انجامِ بشر

بوندیوں میں آگ کا پرتو چٹانوں پر جھلک — مست بادل کی گرج سی کوہساروں میں دھمک

آگ کے خونخوار جبڑوں سے دُھواں اُٹھتا ہوا — پیچ و خم کھا کر زمیں سے آسماں اُٹھتا ہوا

ہر طرف بھیگے ہوئے پیڑوں کے پتے سوگوار — خوف سے ٹھنڈی ہوا کو ہلکا ہلکا سا بخار

کھولتا سینہ سُلگتی کھوپڑی۔ پکتا بدن — بڑبڑاتی آگ جھلاتی لپیٹ جلتا کفن

ٹوٹتی نبضیں چٹختی ہڈیاں اُڑتے شرار — لوتھڑوں کی سنسناہٹ سُرخ شعلوں کی ڈکار

ہونکتے جھونکوں کے آگے چونکتی چنگاریاں — بولتے شعلوں کی لہراتی ہوئی نیلی زباں

ہر طرف لہرا رہا تھا بے ثباتی کا عَلَم — موت کی دیوی کے خونیں قہقہوں کا زیر و بم

میرے قصرِ زندگی میں زلزلہ سا آگیا — روح کے آئینہ خانے میں دھندلکا چھا گیا

بزمِ عشرت اُٹھ گئی طنبورِ غم بجنے لگا — ضربتِ تشویش سے سازِ الم بجنے لگا

عبرت اُٹھی آرزو بیٹھی تمنّا سو گئی — یاس نے انگڑائی لی امید زخمی ہو گئی

رات بھر میرے دلِ محزوں کی بیتابی رہی — خواب پر غالب پریشانیِ بے خوابی رہی

اب بھی وہ منظر کبھی جب یاد آتا ہے مجھے — زندگی میں موت کا نقشہ دکھاتا ہے مجھے

۹۹۔ یوسف ظفر

۱۹۱۴ء

شیخ غلام رسول کے بیٹے۔ کوہ مری پر پیدا ہوئے۔ ۲۵ سال کی عمر

سے شاعری شروع کی۔ ۱۹۳۶ء میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ پہلے لاہور میں کلرک کی نوکری کی۔ احسان دانش اور میرا جی کی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ ۱۹۴۳ء میں رسالہ ہمایوں کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "زنداں" شایع کیا۔

اسرار

چاند کی شب نواز کرنوں میں ... ایک غنچہ حیات پاتا ہے
یخ زدہ برف خوردہ پتّوں کے ... سرد سانسوں سے کپکپاتا ہے
خار بڑھتے ہیں خود جراحت کو ... گر ندامت سے سر جھکاتا ہے
رات بھر دیکھتا ہے تاروں کو ... رات بھر پیچ و تاب کھاتا ہے

کس قدر ہے ستم ظریف مگر
صبح ہوتے ہی مسکراتا ہے

میں بھی اِک غنچہ ہوں گلستاں میں ... اور خزاں کے ستم اُٹھاتا ہوں
چاندکی یاس ریزہ کرنوں میں ... اُس کی مشعلیں جلاتا ہوں
اپنے ماحول کی جفاؤں سے ... میں بھی رازِ حیات پاتا ہوں
زندگی کی شب سیہ لے کر ... موت کی روشنی دکھاتا ہوں

لیکن اہلِ جہاں کی نظروں سے
غم چھپانے کو مسکراتا ہوں

سامانِ تسکیں

دل کی دھڑکن سے عبارت ہیں امیدیں اے دوست
ہر ستارے کو تمنائے بقا ہوتی ہے

آرزو بن کے سمندر کی ابھرتے ہیں حباب
شب کے پہلو سے سحر جلوہ نما ہوتی ہے

کارواں چلتے ہیں منزل کا سہارا لے کر
اور منزل کی کشش راہ نما ہوتی ہے

قطرے قطرے میں ہے طوفانِ تمنا بیتاب
موجِ قلزم کے لیے، آبلہ پا ہوتی ہے

ذرّے ذرّے سے جھلکتی ہے بیاباں کی طلب
پھول کے لب پہ گلستاں کی دعا ہوتی ہے

مضطرب ہے مرے دل میں بھی تو ارماں کوئی
جی رہا ہوں تو بھلا تم پہ ہے احساں کوئی

کچھ نہ کچھ باعثِ تسکیں بھی ہے مایوسی میں
ہر ستارے کی کرن نور میں ڈھل جاتی ہے

ذرہ ہم پہلوئے ذرّہ نظر آ جاتا ہے
خار کی پھانس رگِ گل سے نکل جاتی ہے

متصل چلتے ہیں دریا پہ حبابوں کے حباب
قسمتِ شب مہ و انجم سے بدل جاتی ہے

کارواں منزلِ مقصود کو جا لیتے ہیں
شبنم آغوشِ گلستاں میں مچل جاتی ہے

تم میں اور میرے خیالوں میں بہت دوری ہے
میری تسکین بھی آلودۂ مجبوری ہے

۱۰۰۔ غلام ربّانی تاباںؔ

۱۹۱۴ء

پتورہ تحصیل قائم گنج ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد وہاں کے بڑے زمیندار تھے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں وطن سے نکلے اور جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم پائی۔ علی گڑھ سے انٹر، سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔ اے اور

آگرہ کالج سے ایل ایل بی کا امتحان کامیاب کیا۔ آگرے میں مولانا حامد حسن قادری اور میکش اکبرآبادی کی صحبت میں شعروسخن کے ذوق میں ترقی ہوئی۔ بچپن سے باغی طبیعت تھی۔ انگریزوں سے نفرت اور سیاست سے محبت نے شاعری کو بھی انقلابی بنادیا۔ فتح گڑھ میں وکالت شروع کی تھی لیکن طبیعت کی اُفتاد نے کامیاب وکیل بننے نہ دیا۔ مارکسزم کو نظریۂ حیات قرار دے لیا۔ اور براہِ راست سیاسی تحریکات میں حصہ لینے لگے ۱۹۴۹ء میں گرفتار ہوکر جیل بھی جاچکے ہیں۔ اس کے بعد کچھ دن اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور آجکل مکتبہ جامعہ دہلی میں مینیجر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

تاشقند

شہرِ خوباں ہے یہی شہرِ نگاراں ہے یہی
دوستو مجمعِ ترکانِ حسیں تو دیکھو

میرا ذمہ جو کبھی سوئے فلک جائے نظر
دیکھنے والو مہ و مہر زمیں تو دیکھو

سادگی ہائے در و بام پہ طنزاً نہ ہنسو
ان مکانوں کے طرحدار مکیں تو دیکھو

جس پہ زندانیِ حالات کا کرتے ہو گماں
اُن کے چہروں پہ ذرا نورِ یقیں تو دیکھو

تاج پہ سایہ فگن جیسے گھٹا ساون کی
زلف کی چھاؤں میں تابندہ جبیں تو دیکھو

وہ ضیائیں ہیں کہ خود طور کرے کسبِ فروغ
دورِ رندانِ خراباتِ نشیں تو دیکھو

دستِ محنت نے تراشے ہیں بتانِ صد رنگ
آؤ یہ رشکِ صنم خانۂ چیں تو دیکھو

جلوۂ گل سے بنا آئینہ خانہ گلشن
ذرّے ذرّے میں تب و تابِ نگیں تو دیکھو

گلعذاروں کا بہاروں کا وطن ہے تاباںؔ
تم بھی دُنیا کی یہ فردوسِ بریں تو دیکھو

غزلیں

کوچۂ شوق رہِ فکر و نظر سے گزرے
نقشِ پا چھوڑ گئے ہم تو جدھر سے گزرے

آج اے وحشتِ دل جانے کدھر سے گزرے
کتنے دل چسپ تھے منظر جو نظر سے گزرے

ہم بھی مسجد کے ارادے سے چلے تھے لیکن
میکدے راہ میں حائل تھے جدھر سے گزرے

یہ وہ منزل ہے کہ الیاس بھی گم خضر بھی گم
ہائے آوارگیٔ شوق کدھر سے گزرے

کتنی امواجِ بلا پاؤں کی زنجیر بنیں
کتنے طوفانِ حوادث تھے کہ سر سے گزرے

زاہد و شیخ نیں کیا کیا نہ ہوئی سرگوشی
میکدے جاتے ہوئے ہم جو ادھر سے گزرے

آج تاباںؔ دلِ مرحوم بہت یاد آیا
بعد مدت کے جب اس راہ گزر سے گزرے

اُس شوخ کی ناوک فگنی میرے لئے ہے
وہ کم نگہی، کم سخنی میرے لئے ہے

در پردہ مگر سحر فنی میرے لئے ہے
ہر کوشش تمکیں شکنی میرے لئے ہے

اک سروِ خراماں کو بھی مانگے ہے تمنّا
آشوبِ چمن جوشِ چمنی میرے لئے ہے

غیروں کے لئے حسنِ چمن حسنِ نوازش
اک طرزِ جفا ہے کہ بنی میرے لئے ہے

اے دوست بڑھے اور ترے بزم کی رونق
کافی مری خود انجمنی میرے لئے ہے

غم اور بھی پائے ہیں ترے غم کے علاوہ
فطرت بھی تری طرح غنی میرے لئے ہے

یا زحمتِ عیسیٰ نفسی میرے لئے تھی
یا شیوۂ بے داد تنی میرے لئے ہے

اس دورِ فراغت میں بھی قسمت سے بدستور
تاباںؔ غمِ تشنہ دہنی میرے لئے ہے

۱۰۱ ۔ مخدوم محی الدین

۱۹۱۴ء

میدک حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۳۴ء میں ایم ۔ اے کامیاب کیا۔ سٹی کالج میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ کمیونسٹ خیال اور سیاسی تحریکات کی بنا پر ملازمت ترک کردی۔ عرصے تک روپوش رہے۔ اب حیدرآباد اسمبلی کے رُکن اور دکن کے مشہور سیاسی لیڈر اور مقبول شاعر ہیں۔ سُرخ سویرا کلام کا مجموعہ شایع ہو چکا ہے۔

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا

نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

آگئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی

پتّیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آہی گئے
سجدے مسرور کے مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے

آبھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آبھی جا تاکہ ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

مشرق

جہل فاقہ بھوک بیماری نجاست کا مکاں
زندگانی تازگی عقل و فراست کا سماں

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں نوحہ خواں کوئی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

سپاہی

جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے

کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے

کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے

سُرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے

گر رہا ہے سپاہی کا ڈیرا

ہو رہا ہے مری جاں سویرا

او وطن چھوڑ کر جانے والے

کُھل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے

۱۰۲۔ جاں نثار اخترؔ

۱۹۱۴ء

علی گڑھ سے ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو کے لیکچرار تھے۔ مجازؔ کی بہن صفیہ سے شادی کی، بعد کو ملازمت ترک کر کے فلم انڈسٹری میں کام کرنے کے لئے بمبئی چلے گئے اور اب وہیں ہیں۔ صفیہ اخترؔ نے ان کے نام جو خطوط لکھے ہیں اور جو زیرِ لب کے نام سے چھپے ہیں ان کے باعث ان کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ کلام کا مجموعہ 'سلاسل' شایع ہو چکا ہے۔

خاموش آواز

جنوری کی ایک چاندنی رات میں صفیہ کے مزار پر

کتنے دنوں میں آئے ہو ساتھی
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے

دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو
کتنی تھکن آنکھوں میں گھلی ہے
آؤ تمھارے واسطے ساتھی
اب بھی مری آغوش کھلی ہے

چپ ہو کیوں کیا سوچ رہے ہو
آؤ سب کچھ آج بھلادو
آؤ اپنے پیارے ساتھی
پھر سے مجھے اک بار جلادو

اتنے دن کے بعد کہیں تم
آئے ہو ساجن میرے دوارے
آج اندھیرے انگنا مورے
ناچ اٹھے ہیں چاند ستارے

دیکھو کیسی رات حسیں ہے
جیسے میرا پیار کھلا ہو
آج تو ایسی جوت ہے جیسی
چاند زمیں سے آن ملا ہو

بولو ساتھی کچھ تو بولو
کب تک آخر آہ بھروں گی
تم نے مجھ پر ناز کیئے ہیں
آج میں تم سے ناز کروں گی

آؤ میں تم سے رُوٹھ سی جاؤں
آؤ مجھے تم ہنس کے منا لو
مجھ میں سچ مچ جان نہیں ہے
آؤ مجھے ہاتھوں پر اُٹھا لو

میرے پریتم میرے مالک
مجھ کو میرا جیون دے دو
آج مجھے سینے سے لگا لو
اپنے دل کی دھڑکن دے دو

تم کو میرا غم ہے ساتھی
کیسے اب غم کو بھلا دوں
اپنا کھویا جیون بولو
آج کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں

یہ نہ سمجھنا میرے ساتھی
دے نہ سکی میں ساتھ تمھارا
یہ نہ سمجھنا میرے دل کو
آج تمھارا دُکھ ہے گوارا

یہ نہ سمجھنا میں نے تم کو
جان کے یوں منہ موڑ لیا ہے
یہ نہ سمجھنا میں نے تم سے
دل کا ناتا توڑ لیا ہے

یہ نہ سمجھنا تم سے میں نے
آج کیا ہے کوئی بہانا
دُنیا مجھ سے رُوٹھ چکی ہے
ساتھی تم بھی رُوٹھ نہ جانا

آج بھی ساجن میں ہوں تمھاری
آج بھی تم ہو میرے اپنے
آج بھی ان آنکھوں میں بسے ہیں
پیار کے اَن مٹ گہرے سپنے

دل کی دھڑکن ڈوب بھی جائے
دل کی صدائیں تھک نہ سکیں گی
مِٹ بھی جاؤں پھر بھی تم سے
میری وفائیں تھک نہ سکیں گی

یہ تو پوچھو مجھ سے چھُٹ کر
تیرے دل پر کیا کیا گزری
تم بن میری ناؤ تو ساجن
ایسی ڈوبی پھر نہ اُبھری

ایک تمھارا پیار بچا ہے
ورنہ سب کچھ لُٹ سا گیا ہے
ایک مسلسل رات کہ جس میں
آج مرا دم گھُٹ سا گیا ہے

آج تمھارا رستہ تکتے
میں نے پورا سال بتایا
کتنے طوفانوں کی زد پر
میں نے اپنا دیپ جلایا

تم بن سارے موسم بیتے
آئے جھونکے سرد ہوا کے
نرم گلابی جاڑے گزرے
میرے دل میں آگ لگا کے

بولو ساتھی کچھ تو بولو
کچھ تو دل کی بات بتاؤ
آج بھی مجھ سے دور رہو گے
آؤ مرے نزدیک تو آؤ

آؤ میں تم کو بہلا لوں
بیٹھ تو جاؤ میرے سہارے
آج تمھیں کیوں غم ہے بولو
آج تو میں ہوں پاس تمھارے

اچھا میرا غم نہ بھلاؤ
میرا غم ہر غم میں سمو لو
اس سے اچھی بات نہ ہوگی
یہ تو تمھیں منظور ہے بولو

اب سے اپنا دل نہ دکھانا
میرے لئے فریاد نہ کرنا
مجھ سے کچھ بھی پیار اگر ہے
میرا غم برباد نہ کرنا

میرے غم کو میرے شاعر
اپنے جیون گیتوں میں رچا لو
میرے غم کو میرے شاعر
سارے جگ کی اِک آگ بنا لو

ساون آیا دھوم مچاتا
گھر گھر کالے بادل چھائے
جم سے گئے ہیں میرے دل پر
جانے کتنے گہرے سائے

چاند سے جب بھی بادل گزرا
پھول جو چٹکے میں نے جانا
تم نے شاید مجھ کو پکارا
آئیں بہاریں مجھ کو منانے

آئیں بہاریں مجھ کو منانے
تم بن میں تو مُنہ سے نہ بولی
لاکھ فضا میں گیت سے گونجے
لیکن میں نے آنکھ نہ کھولی

کتنی نکھری صبحیں گزریں
کتنی مہکی شامیں چھائیں
میرے دل کو دُور سے تکنے
جانے مدّت بعد تو پیتم

اتنی مُدّت بعد تو پیتم
آج کلی ہردے کی کھلی ہے
کتنی راتیں جاگ کے ساجن
آج مجھے یہ رات ملی ہے

میرے غم کی آنچ سے ساتھی
چونک اُٹھے گا عزم تمہارا
بات تو جب ہے لاکھوں دل کو
چھولے اپنے پیار کا دھارا

میں جو تمھارے ساتھ نہیں ہوں
دل کو مت مایوس کرو تم
تم ہو تنہا تم ہو اکیلے
ایسا کیوں محسوس کرو تم

آج ہمارے لاکھوں ساتھی
ساتھی ہمت ہار نہ جاؤ
آج کروڑوں ہاتھ بڑھیں گے
ایک زرا تم ہاتھ بڑھاؤ

اچھا اب تو ہنس دو ساتھی
ورنہ دیکھو رو سی پڑوں گی
بولو ساتھی کچھ تو بولو
آج میں سچ مچ تم سے لڑوں گی

جاگ اُٹھی لو دُنیا میری
آئی ہنسی وہ لب پہ تمھارے
دیکھو دیکھو میری جانب
دوڑ پڑے ہیں چاند ستارے

جھلمل جھلمل کرنیں آئیں
مجھ کو چندن ہار پہنانے
جگمگ جگمگ تارے آئے
پھر سے میری مانگ سجانے

آئیں ہوائیں جھانجھ بجاتی
گیتوں مورا انگنا جاگا
مورے ماتھے جھومر دمکا
مورے ہاتھوں کنگنا جاگا

جاگ اُٹھا ہے سارا عالم
جاگ اُٹھی ہے رات ملن کی
اور زمیں کی گود میں ساجن
سیج سجی ہے آج دُلہن کی

آؤ جاتی رات ہے ساتھی
پیار تمھارا دل میں بھر لوں
آؤ تمھاری گود میں ساجن
تھک کر آنکھیں بند سی کر لوں

اُٹھو ساتھی دُور اُفق پر
نرم کنارا کانپ اُٹھا ہے
میرے دل کی دھڑکن بن کر
صبح کا تارا کانپ اُٹھا ہے

دِل کی دھڑکن ڈوب کے رہ جا
جاگی نبضو تھم سی جاؤ
پھر سے میری بے نم آنکھو
پتھّر بن کر جم سی جاؤ

میرے غم کا غم نہ کرو تم
اچھا اب سے غم نہ کروں گی
میرے ارادوں والے ساتھی
جاؤ میں ہمت نہ کروں گی

تم کو ہنس کر رخصت کر دوں
سب کچھ میں نے ہنس کے سہا ہے
تم بن مجھ میں کچھ نہ رہے گا
یوں بھی اب کیا خاک رہے گا

دیکھو کتنے کام پڑے ہیں
اچھا اب مت دیر کرو تم
کیسے جَم کر رہ سے گئے ہو
اتنا مت اندھیر کرو تم

بولو تم کو کیسے روکوں
دُنیا سو الزام دھرے گی
ایسے پاگل پیار کو ساتھی
ساری خلقت نام دھرے گی

آؤ میں اُلجھے بال سنواروں
مجھ سے کوئی کام تو لے لو
پھر سے گلے اِک بار لگا کر
پیار سے میرا نام تو لے لو

اچھا ساتھی جاؤ سدھارو
اب کے اتنے دن نہ لگانا
پیاسی آنکھیں راہ تکیں گی
ساجن جلدی لوٹ کے آنا

لیکن ٹھیرو ٹھیرو ساتھی
دل کو زرا تیّار تو کرلوں
آؤ مرے پردیسی ساجن
آؤ میں تم کو پیار تو کرلوں

۱۰۳۔شکیلؔ بدایونی

۱۹۱۶ء

شکیل احمد قادری ولد مولانا جمیل احمد قادری بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کا امتحان وہیں سے کامیاب کیا اور علی گڑھ سے ۱۹۴۲ء میں بی۔اے کی ڈگری لی۔ مولانا ضیاء القادری کے زیر نظر ۱۹۳۱ء سے شاعری شروع کی۔ جگرؔ مراد آبادی سے استفادہ کیا۔ ۱۹۴۲ء میں دہلی میں سپلائی ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے بعد کو ۱۹۴۶ء سے فلموں کے نغمہ نگار بن گئے اور اس وقت سے بمبئی ہی میں مقیم ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ رعنائیاں ۱۹۴۴ء نغمۂ فردوس ۱۹۴۸ء صنم وحرم ۱۹۵۴ء۔ پہلا اور تیسرا مجموعہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ غزل سے

فطری لگاؤ ہے، اور پڑھنے کا انداز بھی عمدہ ہے۔ جدید غزل گو شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

اللہ اللہ مالِ نظمِ کہن
زندگی زندگی کی ہے دشمن

ہے خود آج کل حریفِ جنوں
ہے جنوں ان دنوں تہی دامن

کیا خبر تھی بہار میں اب کے
چاک ہوں گے دلوں کے پیراہن

وائے بے مائگیٔ فکر و نظر
ہے سخن سے جدا مذاقِ سخن

خونِ انسانیت کے پیاسوں نے
نام صحرا کا رکھ دیا ہے چمن

پھر دلوں میں نئی امنگ اٹھی
لے کے عزمِ شکستِ کوہ و دمن

زندگی کی شکستہ حالی پر
رو رہی ہے شکیلؔ عظمتِ فن

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی ہو وہ بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انہیں اعتبارِ خلوص ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ نشانِ جبرِ شباب ہے، نہ وہ رنگِ قہر و عتاب ہے

دلِ بے قرار پہ ان دنوں ہے ستم یہی کہ ستم نہیں

نہ فنا مری، نہ بقا مری، مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈیے

میں کسی کا حسنِ خیال ہوں، مرا کچھ وجود و عدم نہیں

غمِ عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے

مجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا تو یہ دل نے بد دعا دی

ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

وہ نوائے مضمحل کیا نہ ہو جس میں دل کی دھڑکن

وہ صدائے اہلِ دل کیا جو عوام تک نہ پہنچے

مرے طائرِ نفس کو نہیں باغباں سے رنجش

ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے

یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک

مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقابِ رخ اٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی

اٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

انھیں اپنے دل کی خبریں مرے دل سے مل رہی ہیں

میں جو ان سے روٹھ جاؤں تو پیام تک نہ پہنچے

وہی اک خموشں نغمہ ہے شکیلؔ جانِ ہستی

جو زبان پر نہ آئے، جو کلام تک نہ پہنچے

۱۰۴۔ جگن ناتھ آزادؔ

۱۹۱۸ء

تلوک چند محرومؔ کے فرزند عیسیٰ خیل (مغربی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ کورکوٹ اور میانوالی میں تعلیم پائی اور ۱۹۳۳ء میں راولپنڈی میں کالج میں داخل ہوئے۔ اپنے والد اور عبدالمجید عدمؔ کی صحبت میں شعروسخن کا ذوق پایا۔ اپنے کالج کے میگزین اور دوسرے رسالوں میں کلام چھپواتے رہے۔ ایم اے کے لئے لاہور گئے، اور وہاں تاجورؔ نجیب آبادی سے فیض پایا۔ کانگریس کے اخبار "جے ہند" سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۴۷ء تک اسی میں کام کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد دلی آئے اور پہلے وزارت لیبر میں ملازم ہوئے، بعد کو وزارت اطلاعات کے اردو ماہ نامہ "آج کل" کی ادارت کرنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں انفرمیشن افیسر کے عہدے پر ترقی ملی۔ پہلا مجموعۂ کلام "بیکراں" ۱۹۴۸ء میں شایع ہوا۔ کلام میں سوز و گداز بدرجہ اتم موجود ہے۔ دوسرے مجموعے "ستاروں سے ذرّوں تک" اور "جاوداں" ہیں۔ نثر میں بھی کتابیں چھپی ہیں۔

غزل

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گزری — نہ پوچھئے ہوسِ بال و پر پہ کیا گزری

تمھیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو — سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گزری

یہ کاش تجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا — تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گزری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جُڑ نہ سکے — خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گزری
حضورِ دوست کا عالَم بتا نہیں سکتا — میں کیا کہوں مرے قلب و نظر پہ کیا گزری
نظر تو محوِ غمِ جستجو تھی اے آزادؔ — یہ اس کے ساتھ دلِ بے خبر پہ کیا گزری

اے کشورِ ہندوستاں

اے کشورِ ہندوستاں — اے خطۂ جنّت نشاں
اے سجدہ گاہِ قُدسیاں
اے منبعِ انوارِ حق — اے کعبۂ روحانیاں
اے قبلۂ عرفانیاں — اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

تو ہے وقارِ علم و فن — تو اعتبارِ علم و فن
سرمایہ دارِ علم و فن
گلزارِ ہست و بود میں — تو ہے بہارِ علم و فن
اے علم و فن کے پاسباں — اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

پایا ہے اے عالی گہر — تو نے ریاضت کا ثمر
تجھ پر ہے عالَم کی نظر
فسطائیت کی رات میں — جمہوریت کے عرش پر
چمکا ہے تو مہتاب ساں — اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے منبعِ مہر و وفا اے مخزنِ صدق وصفا
اے مصدرِ نور و ضیا
اس تیرہ باطن دور میں دُہرائے جا دُہرائے جا
مہروفا کی داستاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

افرنگ کی زنجیر کو انگریز کی تدبیر کو
ہر تیغ ہر شمشیر کو
پھینکا ہے تو نے توڑ کر ہر حلقۂ زنجیر کو
اے حرّیت کے رازداں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے مرجعِ ہر عزوشاں عالم ترا افسانہ خواں
دُنیا تری رطب اللساں
افزوں ہو تیرا مرتبہ اے مرتبوں کے رازداں
شائستۂ اوجِ بیاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ہیں تیرے نظارے حسیں روشن دل و روشن جبیں
ذرّے ہیں تیرے عنبریں
تیری ہوائیں دل کشا تیری فضائیں دل نشیں

اے دلکشی کی داستاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

صبحِ بنارس کے بیاں شامِ اودھ کی داستاں
اے نور پاروں کے جہاں

دُنیا کی تاریکی میں ہے تو روشنی کا کارواں
اے منزلِ نورانیاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

بنگال کی رعنائیاں پنجاب کی زیبائیاں
ہیں تیرے دامن میں رواں

افشاں جبیں پر ہے تری کشمیر کا باغِ جناں
رعنائیوں کی داستاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

بنگلور کی ہے سرزمیں یا خطۂ خلدِ بریں
ذرّے جہاں کے دل نشیں

پانی شرابی ہے جہاں مٹّی جہانِ عنبریں
اے رنگ و نکہت کے جہاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

تیرے پہاڑوں میں نہاں دولت کے انبارِ گراں
اے خطۂ دولت رساں

تو قسمتِ بیدار ہے	تو ہے نشاطِ جاوداں
تو ہے بہارِ بے خزاں	اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے خطّۂ گنگ وجمن	اے عالمِ شعر و سخن
کیا شے ہے تیرا بانکپن
تو فلسفے کا دیس ہے	تو شاعری کا ہے وطن
شعروادب کے آسماں	اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے عالمِ دُنیاو دیں	اے سرِّ قفل آہنیں
اے چہرۂ حسنِ یقیں
ہے تیری خاکِ پاک کا	ہر ذرّہ حکمت آفریں
سرِّ حقیقت کے جہاں	اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

وید مقدّس کی زمیں	تقدیسِ عالم کی امیں
روشن دل وتاباں جبیں
بوسے ترے ماحول پر	تلسی کے نغماتِ حسیں
تقدیس کے اے رازداں	اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

تو کرشن کا گہوارہ ہے	تقدیس کا شہپارہ ہے

تنویر کا نظّارہ ہے

تو آسمانِ قدس کا روشن تریں سیّارہ ہے

تقدیس کے اے آسماں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

گوتم کے اے آرام جاں نانک کی بانی کے جہاں

فکر و نظر کے آستاں

اجمیر کی درگاہ سے تیری زمیں ہے آسماں

ذرّے ہیں تیرے کہکشاں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

صابرؒ یہیں عنبر چکاں کاکیؒ یہیں گوہر فشاں

جن سے زمیں ہے آسماں

گورِ نظام الدینؒ کے ہیں ذرّے حریفِ کہکشاں

روحانیت کے رازداں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے سرزمینِ علم و فن فخرِ جہاں فخرِ زمیں

اے میرؔ و غالبؔ کے وطن

مہکا ترے ماحول میں رنگیں تخیّل کا چمن

رنگیں تخیّل کے جہاں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے خطۂ روشن جبیں حالی ترے گھر کا مکیں

یہاں ترا ابنِ یمیں

تو بھارتی کا ہے وطن تو ہے مسرت کی سرزمیں

اے سرزمینِ گلفشاں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

ایران سے آیا یہاں علم و ہنر کا کارواں

شعر و سخن کا رازداں

چمکا گیا تیری فضا دمکا گیا تیرا نشاں

اے اہلِ دل کے آستاں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

وہ عرفیِ شیریں زباں وہ فیضیِ جادو بیاں

وہ مشہدیِ نکتہ داں

سرمد کلیم و آملی سب شاعرانِ درفشاں

تیرے ہیں گنجِ شائگاں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اللہ رے تیری آستیں ہیرے کہیں موتی کہیں

ہر گام پر لاکھوں نگیں

اے گولکنڈے کے جہاں اے لال قلعے کی زمیں

اے دولتوں کے آسماں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

رنگِ اجنتا تجھ میں ہے حسنِ ایلورا تجھ میں ہے
شانِ مدورا تجھ میں ہے
رامیشورم کی سرزمیں سانچی کی دُنیا تجھ میں ہے
فن و ہُنر کے آسماں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

جنّت کی اِک تصویر ہے یا تاج کی تعمیر ہے
اِک موجۂ تنویر ہے
کس بادشاہِ فکر کے خوابوں کی یہ تعبیر ہے
حسنِ تخیل کے جہاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

بابر کی شوکت کے نشاں حیدر کی سطوت کے نشاں
ٹیپو کی صولت کے نشاں
ملتے ہیں تیری خاک پر اکبر کی عظمت کے نشاں
اے عظمتوں کی داستاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

تو اہلِ دل اہلِ بصر تو ناقدِ ذوقِ نظر
تو نکتہ بیں تو دیدہ ور
تو ہے اہنسا کا امیں تو امن کا پیغام بر

اے حاملِ امن و اماں　　اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ٹیگور تیرا ہم زباں　　اقبال تیرا رازداں
قاضی ہے تیرا نغمہ خواں
اور بلبلِ رنگیں نوا　　آزاد تیرا ترجماں
اے شعر و نغمہ کے جہاں　　اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

جو دَور بھی آتا رہے　　تجھ سے ضیا پاتا رہے
تو اس کو چمکاتا رہے
تو دُور بھی نزدیک بھی　　انوار برساتا رہے
انوار کے اے رازداں　　اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ایسا ترا اقبال ہو　　جور و جفا پامال ہو
سارا جہاں خوش حال ہو
اور پھر ترا روئے حسیں　　مارے خوشی کے لال ہو
اے خطۂ راحت رساں　　اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ماضی ترا اے خوش گہر　　مہتاب سے تابندہ تر
اُٹھ اور جا اپنی نظر

اس اُلجھنوں کے دور میں آئینۂ اِمروز پر
اے باعثِ آرامِ جاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

۱۰۵- مجروح سلطان پوری

۱۹۱۹ء

اسرار حسن خاں ولد محمد حسین خاں اعظم گڑھ اودھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد طبابت کرتے تھے، مگر شعر و سخن کی وجہ سے ایسی شہرت پائی کہ طبابت ترک کر دی۔ آج کل فلم انڈسٹری میں گیت لکھتے اور بمبئی میں مقیم ہیں۔ ان کا مجموعۂ غزل شایع ہو چکا ہے اور وہ غزلوں ہی کی وجہ سے ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

دُور دُور مجھ سے وہ اس طرح خراماں ہے ہر قدم ہے نقشِ دل ہر نگہ رگِ جاں ہے
ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے
میرے شکوۂ غم سے عالمِ ندامت میں اِس لبِ تبسّم پر شمع سی فروزاں ہے
فکر کیا انھیں جب تو ساتھ ہے اسیروں کے اے غمِ اسیری تو خود شکستِ زنداں ہے
اپنی اپنی ہمّت ہے اپنا اپنا دل مجروح زندگی بھی ارزاں ہے موت بھی فراواں ہے

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا
رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
غیر ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گُل اور گُل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو مُنہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کُلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

بہہ کر زمیں پہ بھی ابھی گردش میں خوں مرا
قطرے وہ پھول بنتے ہیں خاکِ وطن کے ساتھ

کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجرِ فرنگ
سینے پہ زخمِ نو بھی ہے داغِ کہن کے ساتھ

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیمِ بہار کے
جُنبش میں ہے قفس بھی اسیرِ چمن کے ساتھ

ہشیار سامراج کہ زنجیرِ ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلۂ جان و تن کے ساتھ

اے دُزدِ مالِ خام گداؤں کی سرزمیں
کر لے گی تجھ کو دفن ترے مکر و فن کے ساتھ

بھڑکی ہوئی یہ آگ مرے لالہ زار کی
پھونکے گی تجھ کو خون بھرے پیرہن کے ساتھ

تاریکیوں کی طرح سے مغرب میں بے پناہ
مشرق سے بھاگ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ

مجروحؔ قافلے کی مرے داستاں یہ ہے
رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہزن کے ساتھ

۱۰۶۔ ساحرؔ لدھیانوی

۱۹۲۱ء

چودھری فضل محمد کے فرزند۔ لدھیانے میں پیدا ہوئے اور تعلیم پائی۔

دیال سنگھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۴۰ء سے شاعری شروع کی۔ لاہور میں ادب لطیف اور سویرا ماہناموں کی ادارت کی اور بعد کو دلّی کے ماہناموں شاہراہ اور پریت لڑی کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ آج کل بمبئی میں فلمی نغموں کے کام میں مصروف ہیں۔ نثر میں کارل مارکس اور سامراج دو ترجمے چھپ چکے ہیں۔ ایک طویل نظم پرچھائیاں اور کلام کا مجموعہ تلخیاں شایع ہو چکا ہے۔ ترقّی پسند شاعر ہیں۔

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

آج دکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبّت کی اساس

آج چاندی کی ترازو میں تُلے گی ہر چیز
میرے افکار مری شاعری میرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اُتر آئی ہے

بھوک تیرے رُخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنّائی ہے

دیکھ اس عرصہ گہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں

جاگ گئے ہیں افلاس کے مارے اُٹھے ہیں بے بس دُکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم آنکھوں میں بجلی کے شرارے

چوک چوک پر گلی گلی میں سُرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت اُمڈے آتے ہیں

شاہی درباروں کے دَر سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں

شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دُنیا غصب شدہ حق انسانوں کے

رُسوا بازاری خاتونیں حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں

روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اُٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اُٹھی ہے

جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکے بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر ایک بھبھکتا شعلہ ہو کر

کاندھوں پر سنگین کدالیں ہونٹوں پر بے باک ترانے
دہقانوں کے دَل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

آج پُرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
اُبھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم گڑ نہ سکیں گے

راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رُکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رُکے گا

کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جبّاروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِ الٰہی مُنہ اُترے ہیں غدّاروں کے

ایک نیا سورج چمکا ہے ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

شکستِ زنداں

خبر نہیں کہ بلاخانۂ سلاسل میں — تری حیاتِ ستم آشنا پہ کیا گزری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں — تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری

مگر وہ دیکھ فضا میں غبار سا اُٹھا — وہ تیرے سُرخ جوانوں کے راہوار آئے
نظر اُٹھا کہ وہ تیرے وطن کے محنت کش — گلے سے کہنہ غلامی کے طوق اُتار آئے

اُفق پہ صبحِ بہاراں کی آمد آمد ہے — فضا میں سُرخ پھریروں کے پھول کھلتے ہیں
زمین خندہ لب ہے شفیق ماں کی طرح — کہ اس کی گود میں بچھڑے رفیق ملتے ہیں

شکستِ محبسِ زنداں کا وقت آپہنچا — یہ تیرے خواب حقیقت میں ڈھال آئے ہیں
نظر اُٹھا کہ ترے دیس کی فضاؤں پر — نئی بہار نئی جنّتوں کے سائے ہیں

دریدہ تن ہے وہ قحبائے سیم و زر جس کو
بہت سنبھال کے لائے تھے شاطرانِ کہن
رباب چھیڑ غزل خواں ہو رقص فرما ہو
کہ جشن نصرتِ محنت ہی جشن نصرتِ فن

میں تجھ سے دُور سہی لیکن اے رفیق مرے
تری وفا کو مری جہدِ مستقل کا سلام
ترے وطن کو تری ارض باحمیت کو
دھڑکتے کھولتے ہندوستاں کے دل کا سلام

۱۰۷۔ سلام مچھلی شہری

۱۹۲۱ء

مچھلی شہر ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ عبدالرزاق ولد محمد اسمٰعیل کے فرزند ہیں۔ فاربس ہائی اسکول فیض آباد میں تعلیم پائی۔ متین مچھلی شہری شاگرد داغ سے ابتدا میں اصلاح لی۔ کچھ دن یونی ورسٹی لائبریری الہ آباد میں ملازمت کی اور ۱۹۴۳ء سے اب تک آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم ہیں۔ ترقی پسند شاعر ہیں۔ اور نثر و نظم دونوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں فیض آباد سے نغمہ نکالتے تھے۔ مطبوعات یہ ہیں میرے نغمے ۱۹۳۹ء۔ وسعتیں ۱۹۴۵ء۔ پائل ۱۹۴۸ء اور ایک ناولٹ ۱۹۵۴ء۔ متعدد کتابوں کے مسودے ساقی بک ڈپو کراچی، اور صدیق بک ڈپو لکھنؤ بغرض طباعت دیئے ہیں۔ شاعری کا بچپن سے شوق رہا اور بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے
حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے
بس اِک لطیف تبسم بس اِک حسین نظر
مریضِ دل کی یہ حالت سنبھل تو سکتی ہے

جہاں سے چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں — وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے
حضورِ جام ستاروں سے لڑ کے آیا ہوں — ہَوا کی زد میں بھی یہ شمع جل تو سکتی ہے
پھر اپنے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہوگا — نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے
تری نگاہِ کرم کی قسم ہے اب بھی مجھے — یہی یقین کہ دُنیا بدل تو سکتی ہے
سلامؔ جام و سبو کی یہ شاعری معلوم — وگرنہ اپنی طبیعت بہل تو سکتی ہے

اے نگارانِ دُور افتادہ

اے نگارانِ چمن زارِ اودھ — لکھنؤ یاد تو آتا ہوگا
اے میرے کھوئے ہوئے مہ پارو — تم اسی طرح چمکتے ہو گے
اے مری قوسِ قزح کے ٹکڑو — تم اسی طرح دمکتے ہو گے
اب بھی وہ آنکھ شرابی ہوگی — اب بھی وہ ہونٹ مہکتے ہوں گے
اب بھی زلفوں میں وہی خم ہوگا — اب بھی وہ پاؤں بہکتے ہوں گے
میری تخئیل کی نازک شمعو — نئے پروانے تو آتے ہوں گے
رنگ و نکہت کی حسیں محفل میں — مجھ سے دیوانے تو آتے ہوں گے
گلشنِ نو کے جواں پھولوں میں — یہ ملاقات مبارک تم کو
حسن کی صبح تمھیں راس آئے — عشق کی رات مبارک تم کو
لیکن اس بار سرِ آئینہ — جب کہ تم آؤ سنورنے کے لئے
اور جب تیز ہَوا کی زد میں — زلف مچلی ہو بکھرنے کے لئے
اپنے گیسو سے حفاظت ہونا — آئینہ خود تمھیں بتلائے گا

زلف کیوں بکھری ہے کیوں آنکھ ہے نم
راز یہ سامنے آ جائے گا
جانا پہچانا سا کوئی شاعر
تم سے پوچھے گا "مزاج اچھے ہیں"
خیریت سے تو ہے شمعوں کا جمال
نئے پروانوں کے دل کیسے ہیں"
کوئی چھپ چھپ کے پسِ پردۂ در
آج بھی تم کو بلاتا ہوگا
اے نگارانِ چمن زارِ اودھ
لکھنؤ یاد تو آتا ہوگا

۱۰۸۔ نازش پرتاب گڑھی

۱۹۲۴ء

محمد احمد نازش پرتاب گڑھ اودھ میں پیدا ہوئے۔ کم عمری سے شعر و سخن کا ذوق ہے غزلوں سے نظموں کا بھی کام لیتے ہیں۔ دور از کار خیالات اور تخیل کے دھندلکے ان کے کلام میں نہیں ہیں۔ بلکہ سادگی و پرکاری نمایاں ہے۔ ۱۹۴۸ء میں پہلا مجموعہ لکیریں شایع ہوا۔

سامعین نے کہا

عرش و سدرہ کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
آپ پستی کے مکینوں میں کہاں آ پہنچے
چھوڑ کر اپنے تخیل کا فلک بوس محل
آپ ہم خاک نشینوں میں کہاں آ پہنچے
چور ہو جائیں گے سب آپ کے نازک سپنے
تلخیٔ زیست کے طوفاں سے جو ٹکرائیں گے
ہم میں احساسِ غم و درد زیادہ ہوگا
آپ رنگین غزل گا کے چلے جائیں گے
ہاتھ میلے بھی ہیں گستاخ بھی ہم لوگوں کے
قصۂ دامنِ جانانہ کہاں لائے ہیں آپ
کس قدر گندے ہیں ہم لوگوں کے ننگے تلوے
فرشِ مخمل کا یہ افسانہ کہاں لائے ہیں آپ

آپ چھیڑیں نہ یہاں خلدِ بریں کی باتیں
ہم گنہ گار بھی سُن لیں گے تو پھر کیا ہوگا

دھجّیاں جیب و گریباں کی اُڑائیں نہ حضور
بچّے ننگے ہیں جو چُن لیں گے تو پھر کیا ہوگا

دیکھئے زندوں کی فریاد و فغاں میں آکر
آپ کے مُردوں کا محشر نہ کہیں سو جائے

ہم سے بچئے کہ پسینے میں ہمارے مل کر
آپ کی بوئے گلِ تر نہ کہیں کھو جائے

تیز ہے آنچ یہاں سینوں میں سوزِ غم کی
شمعِ محفل کو پگھلنے سے بچائے رکھئے

شعلے بھڑکے ہیں حوادث کے ہمارے دل میں
پرِ تخئیل کو جلنے سے بچائے رکھئے

بات آرائشِ محفل کی نہ چھیڑیں حضرت
ہم کہ ہیں مفلس و نادار کہیں لوٹ نہ لیں

ہیں یہاں جاڑے کی شدّت سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگ
قصرِ گرمئ رُخسار کہیں لوٹ نہ لیں

زہر بھی ہم کو میسّر نہیں کیا ذکرِ دوا
دیدۂ نرگسِ بیمار کو واپس لے جائیں

کوئی تہذیب نہ احساسِ لطافت ہم میں
آپ اس یارِ طرحدار کو واپس لے جائیں

جرم ہوتا ہے اگر اشک بہائیں ہم لوگ
ذکرِ شبنم جو چھیڑے گا تو قیامت ہوگی

جس جگہ ہم ہیں وہاں حکم تڑپنے کا نہیں
مرغِ بسمل نہ بنے آپ عنایت ہوگی

پیچ و خم درد کے ہیں بھوک کی اندھیاری ہے
لیلیٰ فکرِ رسا راہ بھٹک جائے گی

دیکھئے کتنا گراں بار ہے ماحولِ حیات
شاعری آپ کی نازک ہے لچک جائے گی

یہ چمکتے ہوئے سپنے یہ لہکتی تانیں
دل کے بہلانے کو بے شک یہ خیال اچھا ہے

ہم جسے پا بھی سکیں اور جسے چکھ بھی سکیں
جامِ جمشید سے وہ جامِ سفال اچھا ہے

اعتذار

ساہتیہ اکادمی کی کوشش تھی کہ مندرجہ ذیل شاعروں کی نظمیں بھی اس انتخاب میں ضرور شایع کی جائیں لیکن چونکہ ساہتیہ اکادمی اپنی پوری کوششوں کے باوجود ان شاعروں سے یا اصحاب سے جن کے پاس کلام کا کاپی رائٹ موجود ہے، اشاعت کی اجازت نہیں پا سکی۔ اس لئے اُن کا کلام اس انتخاب میں نہیں چھاپا جا سکا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس مجبوری کے لئے ہمیں معاف کیا جائے گا۔

•

۱۔ امیر اللہ تسلیمؔ
۲۔ محمد حسین آزادؔ
۳۔ اکبرؔ الہ آبادی
۴۔ شادؔ عظیم آبادی
۵۔ علی حیدر طباطبائیؔ
۶۔ احمد حسین مائلؔ
۷۔ جوالا پرشاد برقؔ
۸۔ بے نظیرؔ شاہ وارثی
۹۔ امرناتھ ساحرؔ
۱۰۔ سیّد جلال الدین توفیقؔ

۱۱۔ کشن پرشاد شاد

۱۲۔ نوبت رائے نظر

۱۳۔ برج نرائن دتاتریہ کیفی

۱۴۔ وحید الدین سلیم

۱۵۔ سراج الدین سائل دہلوی

۱۶۔ جلیل مانک پوری

۱۷۔ مقبول حسین ظریف لکھنوی

۱۸۔ سر ڈاکٹر محمد اقبال

۱۹۔ ظفر علی خاں

۲۰۔ آزاد انصاری

۲۱۔ چودھری خوشی محمد ناظر

۲۲۔ درگا سہائے سرور

۲۳۔ آرزو لکھنوی

۲۴۔ حسرت موہانی

۲۵۔ فانی بدایونی

۲۶۔ رضی الدین حسن کیفی

۲۷۔ رام پرشاد ناشاد

۲۸۔ رضا علی وحشت کلکتوی

۲۹۔ صفی اورنگ آبادی

۳۰۔ برج نرائن چکبست

۳۱۔ اصغر گونڈوی

۳۲۔ یاس یگانہ چنگیزی

۳۳۔ مہاراج بہادر برق

۳۴۔ عظمت اللہ خاں

۳۵۔ اندرجیت شرما

۳۶۔ میلارام وفا

۳۷۔ سید علی منظور

۳۸۔ امرچند قیس

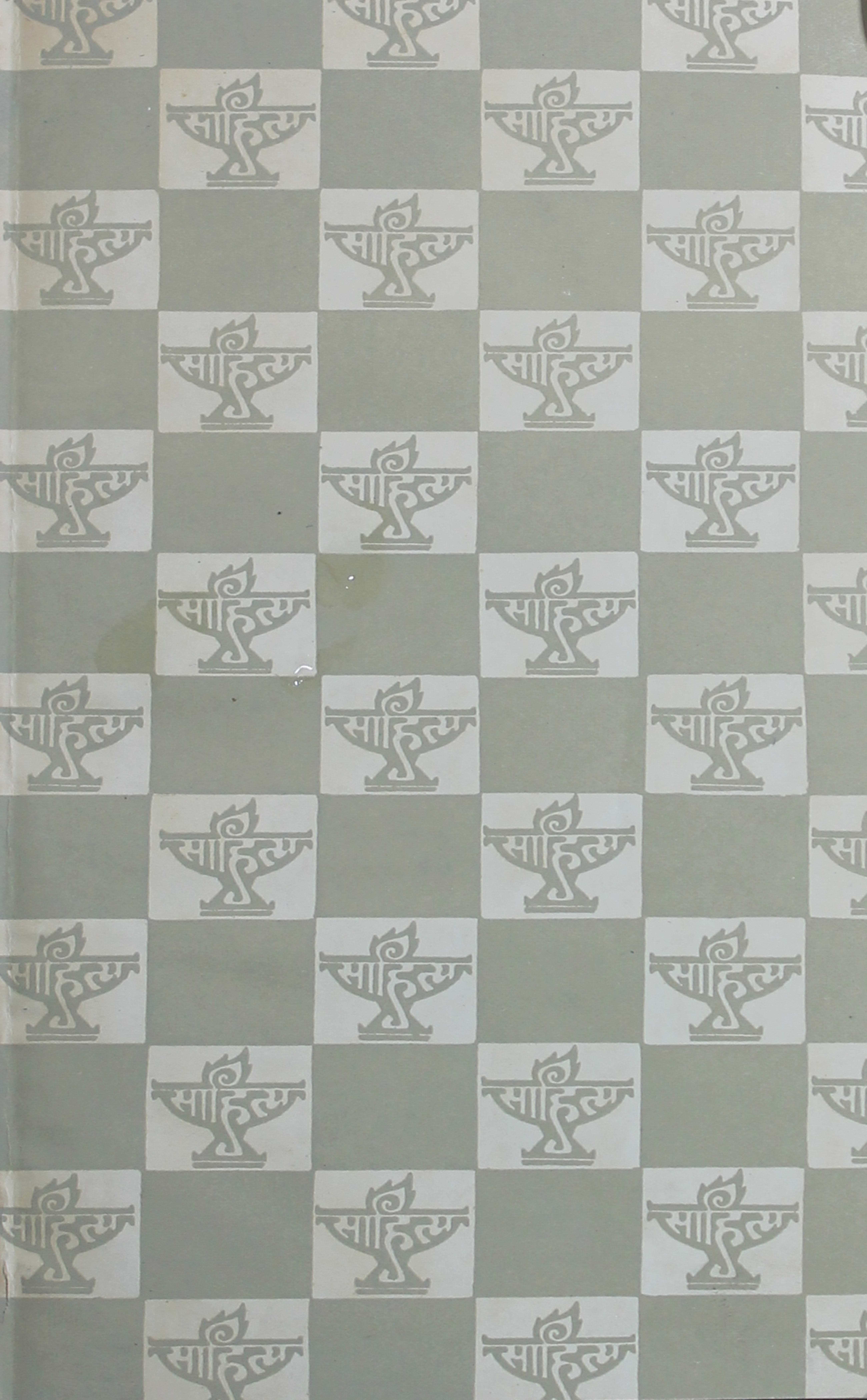
۳۹۔ اختر شیرا

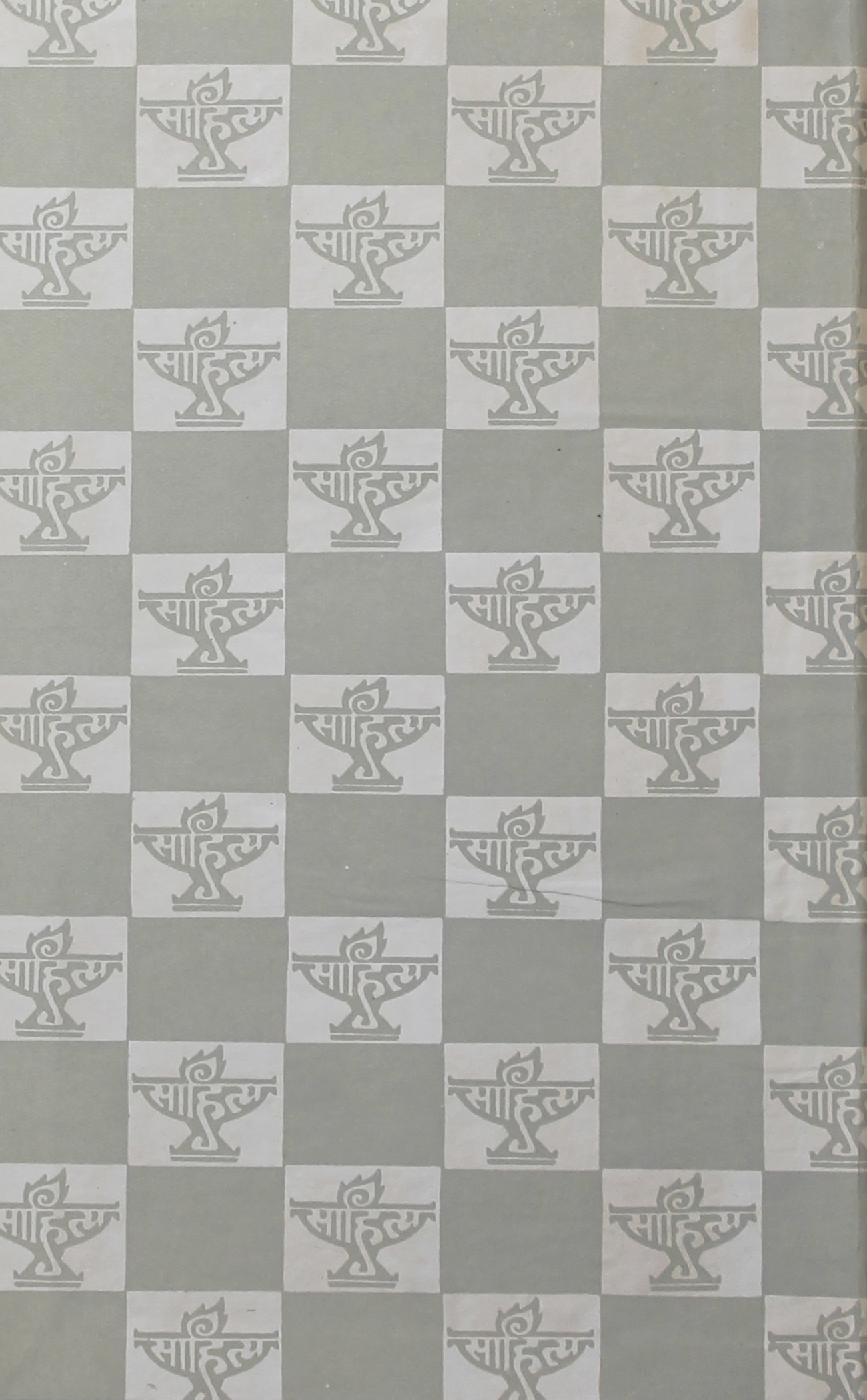
۴۰۔ رسا جاودانی

۴۱۔ ن۔م راشد

۴۲۔ میرا جی

۴۳۔ کیفی اعظمی




साहित्य

ساہتیہ اکادمی کے اُردو مشاورتی بورڈ کی فرمایش
پر اُردو شعرا کے کلام کا یہ انتخاب مرتب کیا گیا ہے۔
اس میں اُردو کے بہترین اور اپنے اپنے دَور اور
مکتبِ خیال کے نمائندہ (۱۵۰) شعرا کا منتخب
کلام شریک ہے۔ سنہ ۱۴۵۰ء سے آج تک کے پانچ سو سالہ
طویل دَور میں اُردو زبان میں ہزاروں چھوٹے
بڑے شاعر پیدا ہوئے اور چونکہ یہ کسی ایک ہی
لسانی یا سیاسی علاقۂ ہند کے رہنے والے نہیں بلکہ
اقصائے ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے تین سو چھ صفحات
کی ایک مختصر سی جلد میں ان کا احاطہ کرنا آسان نہ تھا۔
پہلے ان کی ایک فہرست تیار کی گئی اور اُردو کے
مشاورتی بورڈ کے ارکان اور دیگر اہلِ ذوق صاحبان
کے یہاں بغرض مشورہ ارسال کی گئی۔ اس طرح متعدد
اصحاب کی رائیں حاصل کرنے کے بعد ہر شاعر کے رتبے اور
خصوصیات کے لحاظ سے کم زیادہ کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔

ساہتیہ اکادمی ہندستان کے مختلف زبانوں کی شاعری
کے جو انتخابات شایع کر رہی ہے ان میں اُردو شاعری کے
انتخاب کی کمی عرصے سے بُری طرح محسوس ہو رہی تھی وہ اس کی
اشاعت کے بعد دور ہو جائے گی۔

قیمت ۷ روپے ۵۰ نئے پیسے